کتاب و سنت اور اسلافِ اُمت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:14 Issue:4 April 2021

مُدیر

مولانا محمد عبدالقوی

اِدارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی

مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ:۱۲۱)

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، جب کہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، تو وہ لوگ ہی (درحقیقت) اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہوں تو ایسے لوگ ہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

تشریح: قرآن مجید ذات خداوندی سے نکلنے والا وہ کلام ہے جو انسانیت کی رشد وہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے، وہ آئینہ تمثال ہے جس میں اقوام وملل کے نقائص وعیوب نظر آتے ہیں، وہ راہنما ہے جس میں شعبہ ہائے زندگی کی ہر دینی ضرورت کی تکمیل ہے، وہ مونس وشافع ہے جو قدرداں مومن کے لئے قبر میں انیس اور آخرت میں سفارشی ہے، وہ شاکی بھی ہے جو روز محشر ناقدروں کے لئے شکوہ کناں ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زیارت، تلاوت، تدبر وتفکر، حفظ وفہم، استنباط مسائل، اوامر پر عمل آوری، منہیات سے اجتناب سب کا سب عبادت ہے، اس کتاب کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس کے شغل میں رفعت وبلندی ہے اور اس سے بے اعتنائی میں ذلت وخواری ہے ان اللہ تعالیٰ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین۔

قرآن مجید کی تلاوت اور اس سے شغف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کی ذمہ داریوں میں سے سب سے پہلی ذمہ داری تلاوت قرآن مجید بتلائی ہے یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیَاتِہٖ الخ بعد میں دوسری ذمہ داریوں کا تذکرہ فرمایا پھر تلاوت کے آداب بھی سکھلائے وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا کہ

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، حیدرآباد

قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو، ایک جگہ تلاوت کا افضل وقت بھی ذکر فرمایا اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِيْلًا کہ رات کے قرآن کے الفاظ صاف صاف ادا ہوتے ہیں۔ ایک جگہ نبی پاک ﷺ کی زبانی ارشاد خداوندی ہے اُمرت ان اتلو القرآن کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کا اہتمام کروں، جب تلاوت قرآن کے احکامات وآداب اس قدر ہیں تو یقیناً اس کے فضائل اور وعدے بھی ہوں گے۔

چنانچہ نبی پاک ﷺ نے تلاوت قرآن کو افضل ترین عبادت قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا افضل عبادۃ امتی قراءۃ القرآن میری امت کی افضل ترین عبادت قرآن مجید کی تلاوت ہے، تلاوت قرآن مجید کو افضل ترین عبادت اس لئے قرار دیا گیا کہ جتنے راستے تقرب الی اللہ کے ہیں ان تمام میں اسہل واقرب ترین راستہ قرآن مجید کی تلاوت کا ہے انکم لا ترجعون بشیئی افضل مما خرج منه یعنی القرآن کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب سب سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ نبی پاک ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اپنے اوپر قرآن کی تلاوت کو لازم کرلو علیک بتلاوۃ القرآن فانه نور لک فی الارض وذخر لک فی السماء اپنے اوپر قرآن کی تلاوت کو لازم کرلو کیوں کہ یہ تمہارے لئے زمین میں نور ہے اور آسمان میں ذخیرہ ہے، فتنوں کے اس دور میں اگر قرآن ہمارے روبرو ہدایت کا سامان لے کر آئے تو اس سے بڑی دینی کامیابی اور کیا ہوگی پھر اخروی کامرانی تو یقینی ہوگی، ہر مسلمان کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے خواہ وہ عمل کے اعتبار سے کتنا کوتاہ کیوں نہ ہو کہ میری آخرت سنور جائے میں کسی طرح دوزخ سے محفوظ و مامون ہو جاؤں اس اہم مسئلہ کا حل بھی نبی پاک ﷺ نے بیان فرمایا اقرؤا القرآن فانه یأتی یوم القیامة شفیعا لاصحابه یعنی قرآن پڑھو کیوں کہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے سفارشی بن کر آئے گا۔

تلاوت قرآن مجید کی جس قدر اہمیت وافادیت کتاب وسنت میں بیان کی گئی ہے اسی قدر ہمارا رشتہ قرآن سے کمزور ہوتا جارہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس دور میں بھی امت مسلمہ کا رابطہ تلاوت اور عمل کے اعتبار سے مستحکم رہا سرخروئیاں ان کا مقدر رہیں اور جب امت نے اسے حرز جاں نہیں بنایا ذلت وخواری نصیب میں آئی ، یہ قرآن تو ہماری ھدایت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر عمل کرنا جہاں مقصود زندگی ہے وہیں اس کی تلاوت بھی ازحد ضروری ہے اس لئے کہ اس میں قلب وروح کی تسکین ہے، معصیت سے بچانے میں مؤثر ہے، طاعات کا مزاج بنانے، ایمان کو جِلا بخشنے میں پُرتاثیر ہے، امراض سے شفاء اور غموم وھموم میں قرار وچین ہے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رَبِیعَ قُلُوْبِنَا وَنَوِّرْ صُدُوْرَنَا وَ جِلَاءَ اَحْزَانِنَا۔ آمین



درسِ حدیث

میں روزہ دار ہوں

مولانا سید نذیر احمد یونس قاسمی*

عن أبی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :إذا کان یوم صوم أحدکم فلا یرفث ولا یصخب، فإن سابه أحد أو قاتله فلیقل إنی صائم (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو نہ وہ شہوانی باتیں کرے اور نہ شور و شغب کرے، اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرے، یا اس سے جھگڑا کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔

تشریح: روزہ کا مقصد: بہیمیت کو مغلوب کرنا اور ملکوتی صفات کو انسانی طبیعت میں پروان چڑھانا ہے، یہ بات تو واضح ہے کہ عمل جتنا اہم ہوتا ہے اس کے احکام اور نزاکتیں بھی اتنی ہی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، روزہ افضل ترین اور اہم ترین عمل ہے، یہ ایمان والوں کے تزکیہ اور صفائی قلب و روح کا ذریعہ ہے؛ اس لیے جہاں روزہ کی ترغیب دی گئی اور اس اہم فریضہ کی جانب متوجہ کیا گیا وہیں اس عمل کو خالص کرنے اور مرضیات ربانی کے مطابق کرنے کا حکم بھی دیا گیا، اور یہ طے شدہ بات ہے کہ عمل جتنا خالص ہوتا ہے اتنا ہی خدا تعالیٰ کو محبوب ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے بندہ تقرب الٰہی کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے۔

روزہ کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ شہوت سے ٹکرلے کر انجام دیا جانے والا عمل ہے؛ جس کو حدیث میں فرمایا گیا کہ ''بندہ اپنی خواہش نفس اور کھانا پینا میری وجہ سے چھوڑتا ہے'' مطلب یہ ہوا کہ یہ گناہ مٹانے والا عمل ہے اور اس سے بہیمیت مغلوب ہوتی ہے، جب روزہ کے ذریعہ سے تطہیر نفس کا یہ عمل شروع ہوتا ہے تو نفس بھی مقابلہ میں اتر جاتا ہے اور بالخصوص عام طبیعتیں جو سال بھر رذائل میں ملوث ہو کر نفس کو توانا کی ہوئی ہوتی ہیں ان کی اپنے نفس سے مقابلہ آرائی آسان نہیں ہوتی وہ انسان کو ورغلاتا ہے، بہکاتا اور پھسلاتا ہے، اور بھوک و پیاس کی وجہ سے طبیعت میں جو بدلاؤ آتا ہے اس کو برداشت نہیں کرتا اور

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارۂ ہذا

عام دنوں میں جو عام عادتیں تھیں انہیں کی جانب متوجہ کرتے رہنا ہے۔

اسی لئے نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے اس طرح سے کہ وہ شیطان اور نفس کے حملوں سے بچاتا ہے اور آدمی پر ان کا قابو نہیں چلنے دیتا، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہ روزہ واقعی روزہ ہو، گناہوں سے اس روزے کو آلودہ نہ کیا ہو جس کو نبی علیہ السلام نے فرمایا "مالم یخرقھا" جب تک وہ ڈھال کو نہیں پھاڑتا وہ اس کی حفاظت کا ذریعہ ہے، جب وہ اس ڈھال کو پھاڑ دیتا ہے اور اس سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر وہ روزہ اس کا محافظ نہیں رہتا ویسے تو روزہ دار کو ہر قسم کے گناہوں سے بچنا لازمی وضروری ہے، لیکن مذکورہ حدیث میں دو باتیں بطور خاص ذکر کی گئی ہیں:

(۱) اپنی زبان کو شہوانی اقوال وافعال سے پاک رکھے، یعنی نامحرم مردوں اور عورتوں سے بات چیت اور چیاٹنگ یہ تو حرام ہے ہی اپنی حلال بیوی کے بوس وکنار سے بھی بچے، اگرچہ فقہاء کے نزدیک یہ جائز عمل ہے؛ لیکن روزہ کے مقصد کے حصول میں مانع ہے اس لیے یہ حکم دیا کہ "فلا یرفث" (۲) درندگی والے اقوال وافعال سے بچے اور پرہیز کرے، اس کے لیے نہ شور وشغب کرے عموماً لوگ چڑاچڑاہٹ کا شکار ہو کر چیخ وپکار کرنے لگتے ہیں کہ بات بات پر ان کا غصہ بڑھ جاتا ہے اور بے قابو ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں اس سے منع کیا گیا؛ اور یہ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے کہ قرآن مجید نے اس کو گدھے کی آواز کے مشابہ قرار دیا۔ جس طرح خود جھگڑا کرنا درست نہیں ہے اسی طرح کسی دوسرے کے بلاوجہ الجھنے پر بھی تحمل اور ضبط کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے؛ یہاں تک کہ اگر وہ اس کے ساتھ گالی گلوچ کرے یا اس سے جھگڑنے لگے تب بھی روزہ دار کا فریضہ ہے کہ صاف کہدے کہ میں روزہ دار ہوں میں تجھ سے لڑنا نہیں چاہتا۔ جب روزہ دار اس مرحلہ پر آجائے گا تو پھر اس کو روحانیت کا کمال حاصل ہوگا جو روزہ کا مقصد ہے، ورنہ تو دربار نبوت سے کھلا اعلان ہے "رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع" کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کو بھوکا رہنے کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ایسے روزہ داروں نے ظاہری روزہ کی تکمیل ضرور کی ہے لیکن اُنھیں حقیقی روزہ کے فوائد انہیں حاصل نہیں ہو سکے۔

افسوس کہ امت کا ایک بڑا طبقہ عبادات کو عادات کے انداز میں کرنے لگا ہے اور مقاصد عبادت کی جانب سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں ہے، جس کے نتیجہ میں روزہ بھی چل رہا ہے اور برائیاں بھی چل رہی ہے بھوک پیاس برداشت کی جارہی ہے ساتھ ہی اس کے تقاضے پامال بھی کیے جارہے ہیں۔ نیکی کی پونجی کو محفوظ کرنے کا کوئی احساس اور خیال نہیں، خدا توفیق دے کہ ہم ماہ مبارک کے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوں اور اعمال کا خزانہ اور نیکی کی پونجی کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں سرفراز وکامران ہو جائیں۔ وماتوفیقی الا باللہ

پیش گفتار

از: مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وبہ نستعین

(۱)

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ نہایت رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ اسلامی جنتری کا موسم بہار ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اواخر شعبان میں ضرورت محسوس فرمائی تھی کہ صحابہ کرامؓ کے سامنے اس کے آنے کی خبر دیں اور اس کی خصوصیات بیان فرمائیں، چناں چہ صحیح ابن خزیمہ میں سیدنا سلمان فارسیؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا درجِ ذیل خطبہ مروی ہے۔

”لوگو! تمہارے سروں پر ایک عظمت و برکت والا مہینہ سایہ فگن ہے، ایسا مہینہ جس کے دنوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزے فرض کئے اور راتوں میں قیام (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا، جو کوئی اس مہینے میں کوئی نیک کام کرے گا، اس کو عام دنوں کے فرض کے برابر اجر ملے گا اگر کوئی فرض عمل کرے گا تو اس کو ستر فرضوں کے برابر ثواب دیا جائے گا، یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے جس کا ثواب جنت ہے، اور یہ مہینہ غریبوں سے ہم دردی وغم خواری کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں مومن کی روزی میں اضافہ کردیا جاتا ہے، اس مہینہ میں جو کوئی کسی روزے دار کو افطار کرادے تو اس کا یہ عمل اس کی مغفرت اور جہنم سے نجات کا سبب بن جاتا ہے، نیز اس کو اس روزے دار کے اجر وثواب میں کمی کئے بغیر اس کے روزے کا اجر دیا جاتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اس لائق نہیں ہے کہ روزہ دار کو افطار کرائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ اجر اس کو بھی مل جائے گا جو روزہ دار کو پانی کا پیالہ پیش کردے یا لسی کا ایک گھونٹ پلادے، (آگے فرمایا) اس مہینے کا پہلا عشرہ رحمت ہے، دوسرا مغفرت اور تیسرا جہنم سے نجات کا سبب، جو شخص اس مہینے میں (روزے کی وجہ سے) اپنے خدام کے کاموں میں کمی

کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں اور جہنم سے نجات دلاتے ہیں ، اور اس مہینے میں تم لوگ چار اعمال کا (بہ طور خاص) اہتمام کرو، (ان میں سے) دو تو وہ ہیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرسکو گے اور دو ایسے اعمال ہیں جن کے بغیر تمہیں چارہ نہیں، تو جن دو خصلتوں سے تم اپنے رب کو راضی کرسکو گے وہ ہیں کلمۂ شہادت کا پڑھنا اور استغفار کا کرنا، اور وہ دو کام جن کے بغیر تمہیں چارہ نہیں جنت کا سوال کرنا اور جہنم سے پناہ مانگنا ہے، اسی طرح جو کوئی رمضان میں کسی روزے دار کو اچھی طرح سیراب کر دے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن حوضِ کوثر سے سیراب فرمائے گا کہ پھر اُسے جنت میں داخلے تک پیاس نہیں لگے گی۔'' (ابن خزیمہ: 1887)

حدیث تو ایک راوی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہے مگر حدیث میں مذکورہ اعمال اور ان کے فضائل دیگر بہت سی روایتوں سے ثابت اور قابل عمل ہیں، بہر حال ہر مومن کو چاہیے کہ رمضان المبارک کی ہر ممکن قدر کرے اور فرائض و واجبات کے علاوہ سنن و نوافل کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا رہے۔

(۲)

فروری کے شمارے میں اس عاجز نے مدارس کے نظام تعلیم سے متعلق چند معروضات پیش کئے تھے، اگر چہ یہ معروضات کوئی نئے نہیں تھے گذشتہ چند برسوں سے وقفے وقفے سے اہل علم و نظماءِ مدارس کی یاددہانی کے لئے پیش کرتا ہی رہا ہوں ،لیکن اس دفعہ ''نیو ایجوکیشن پالیسی'' کے حوالے اور مذاکرے کے ساتھ لکھی تھیں تو اسے کافی حد تک توجہ دی گئی ،مختلف علاقوں میں وہ مضمون علاحدہ بھی شائع کیا گیا، تاہم بعض گوشوں سے کچھ اندیشے خطرات اور اشکالات بھی سامنے آئے ،اس وقت انہی کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے جا رہا ہوں:

● پہلی بات تو یہی ہے کہ مدرسہ میں بقدر ضرورت عصری تعلیم داخل کرنے کی سفارش وحمایت میرے شخصی تجربات اور احساسات کا نتیجہ ہے، مجھے اس پر کوئی اصرار نہیں ہے کہ یہی خیال صحیح ہے اور اسے ہر کوئی تسلیم کرے، میں کیا اور میرا تجربہ کیا؟ لیکن ایک طویل دینی اور عوامی خدمت نے میرے دل میں ان باتوں کو بہت مضبوط کیا جن کا میں نے اس تحریر میں اظہار کیا ہے، اور میرا خیال اپنے تجربات کی روشنی میں یہی ہے کہ اہلِ مدارس نے اگر اب بھی اس مسئلے کو سنجیدہ نہ لیا اور عملی اقدام نہ کیا تو یہ وہ غلطی ہوگی جس کو اگلی نسل معاف نہ کرے گی اور وہ نقصان ہوگا جس کی تلافی برسہا برس تک نہ ہو سکے گی۔

● دوسری بات یہ ہے کہ میرے معروضات کا حقیقی منشاء شاید کسی مختصر مضمون کے ذریعہ میں سمجھا نہیں پا رہا ہوں ،اسی وجہ سے شبہات و اشکالات بلکہ الزامات سامنے آ رہے ہیں، کیوں کہ نہ میں جدید تعلیم یافتہ طبقے

کے اعتراضات اور نظریات سے مرعوب ہوں اور نہ ہی علم دین کے حصول اور عالم دین بننے کے لیے مدارس کے اندر جاری نصاب اور کتب کو نا کافی سمجھتا ہوں، بلکہ میرا مطمح نظر صرف اس قدر ہے کہ فارغینِ مدارس کی ذمہ داریوں میں جہاں تدریس وتعلیم کے ذریعے علوم اسلامیہ اور سلف کے نقطۂ نظر کو بعینہٖ اگلی نسلوں میں منتقل کرنا ہے وہیں ان کے ذمے احکام اسلامیہ کی تحقیق اور عوام الناس تک تبلیغ بھی ہے، وہ بھی ان کی فہم اور سمجھ کے مطابق!

یہ دوسرا کام موجودہ دور میں بہ قدرِ ضرورت عصری تعلیم اور علاقائی وعالمی زبان پر قدرت کے بغیر متعذر ہوگیا ہے بلکہ خود اپنی نجی ضرورتوں کی تکمیل مشکل ہوگئی ہے اور اہم سے اہم کام بہی خواہوں اور قدر دانوں سے تعاون حاصل کرنے کے محتاج ہوگئے ہیں، علماء کرام جدید تعلیم یافتہ طبقے میں حق کا احقاق اور باطل کا استرداد یا تو کر نہیں پا رہے ہیں یا پھر ترجمان کے ذریعے کر رہے ہیں جو بجائے خود ایک خطرہ ہے۔

آئے دن اسلام پر حملے ہو رہے ہیں، جان بوجھ کر غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں، جن سے اچھے اچھے خوش عقیدہ مسلمان متأثر ہوتے نظر آرہے ہیں، عام نوجوانوں کا تو کہنا ہی کیا؟ ایسے میں علماء کرام عام طور سے خود اپنے علاقے کی زبان تک نہیں جانتے یا اس میں کمال نہیں رکھتے صرف اپنی اصطلاحات اور مدرستی زبان میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں جس کا تحمل مخاطب قوم کو نہیں ہے، غیر مسلم تو دور کی بات اہل اسلام بھی پوری طرح سمجھ نہیں پاتے، یہ ایک زمینی حقیقت ہے محض خیال نہیں، ہمارے اجتماعات اور پروگراموں میں جو طبقہ نظر آتا ہے وہ ملت کا وہ مختصر سا طبقہ ہے جو دین اور علمائے دین سے وابستہ ہے، مسلمان اسی ایک محدود ومختصر طبقے میں منحصر نہیں ہیں، اس سے کہیں زیادہ بڑا طبقہ مسلمانوں کا وہ ہے جو علماء کے عالمانہ خطابات کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ان کے دروس ومواعظ میں نظر آتا ہی نہیں ہے، تاہم انہیں بھی دین کی پیاس ہے جس کے بجھانے کے لئے انہوں نے ان لوگوں کا سہارا لے رکھا ہے جو بزعم خویش بڑے عالم وداعی بنے ہوئے ہیں، خود حق سے بے خبر اور حق ناشناس ہونے کے باوجود علما کو دقیانوس اور دین سے بے خبر بتلاتے ہوئے بھولے بھالے مسلمانوں کو گُم راہ کر رہے ہیں یعنی ہمارے پاس حق اور مستند علم ہے مگر زبانِ قوم اور اندازِ تفہیم نہیں اور ان کے پاس جہل مرکب اور زعمِ دانستن کے علاوہ کچھ نہیں ہے مگر قوم کے شعور وفہم کے مطابق گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اب آپ ہی سوچیے قوم کدھر جائے گی؟

لوگوں کے گمراہ ہونے کا اور علماء سے دور ہوتے جانے کا رونا روتے رہنا اور اس پر غم وماتم کرتے رہنا مسئلہ کا حل ہے یا ان کی گمراہی ومحرومی کے اسباب کھوجنا اور حل نکال کر ان تک پہنچنا ضروری ہے؟

اتنا تو سب عقل وعلم والوں کے نزدیک مسلم ہے کہ داعی کو قوم کی سمجھ کے مطابق کلام کرنا ضروری ہے——

بلکہ کہیں حدیث ہی میں یہ روایت نظر سے گذری ہے جس میں قوم کی سمجھ سے بلند تر گفتگو کرنے والے خطیب کی مذمت فرمائی گئی ہے۔۔۔ تو یہ اب جو کچھ ہو رہا ہے اور آئے دن نت نئے فرقے ظہور میں آ کر قوم کو اپنے انداز دعوت اور قوت تفہیم کے ذریعہ برباد کرتے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ عالمانہ فاضلانہ تقریروں اور اصطلاحاتِ قدیم سے بھرپور تحریروں کے ذریعے ان کو غلط قرار دیے جا رہے ہیں، حد یہ ہے کہ جن کو سمجھانا چاہ رہے ہیں وہ اور اُن کا معیارِ فہم ہم سے اور دور ہوتے جا رہے ہیں اس مصیبت کے دو حل ہو سکتے ہیں، کروڑوں مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ علماء کی زبان سیکھیں یا علما سے کہا جائے کہ وہ قوم کی زبان اور ان کا معیارِ فہم سیکھیں پہلا ناممکن ہے اور دوسرا ممکن! یہی سنت اللہ بھی ہے ’’وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ‘‘۔۔۔۔

اس لئے آنے والے زمانے میں ملت اسلامیہ کو گمراہوں اور الحاد وارتداد کے فتنوں سے بچانے کے واسطے جو علما تیار کئے جا رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت آنے والے زمانے کے حالات کے مدنظر کی جانی چاہئے، ابھی تک ہم بہت مسلمان کھو چکے، یہ کام کم از کم بیس برس قبل ہی شروع کر دیتے تو فتنوں سے اتنا نقصان نہ ہوتا جو ہو چکا، اب بھی اگر ہم مدارس کے نصاب و نظام پر خصوصی توجہ دیں اور مقاصد کو ٹھیس پہنچائے بغیر وسائل و ذرائع کے طور پر ضروری عصری علوم دینی مدارس کے نصاب میں شامل کر لئے جائے تو مسلمانوں کی بڑی تعداد گمراہی سے محفوظ ہو سکتی ہے۔

اہل مدارس کو یہ دعوت ایک امانت ہے جو ’’معذرة الی ربکم ‘‘ کے طور پر نہایت ادب واحترام کے ساتھ دے رہا ہوں، گو چھوٹے منہ اور قاصر قلم ہی سے سہی! پھر بھی ہر صاحب رائے کو اختلاف کا پورا حق ہے اگر میری یہ معروضات اہل علم کے نزدیک ناقابل التفات ہیں تو میری لاعلمی و کم فہمی پر محمول کر کے نظر انداز فرما دیا جائے۔

● بعض لوگ۔۔۔ جن کے بیانات اخباروں اور سوشل میڈیا پر چلتے رہتے ہیں وہ۔۔۔ یہ کہتے ہیں کہ ’’مدارس کا نصاب شروع ہی سے غلط رہا اور ہمارے بزرگوں نے ہی صحیح کام نہیں کیا‘‘ میں ان سے متفق نہیں ہوں اور بار بار ان کی تردید کر چکا ہوں، میرا ماننا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے حالات میں جو کچھ کیا وہی برحق تھا ان کا اقدام اور نظام ان کی دور اندیشی اور سلامتیٔ فکر و نظر کا ثبوت ثابت ہوا، امت ان کے احسانات و خدمات کے بوجھ سے سبک دوش نہیں ہو سکتی اور تاریخ اُنہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی، فجزاھم اللہ احسن الجزاء

لیکن دو صدیاں گذر جانے اور وسائل و ذرائع میں بے پناہ تبدیلیوں اور اضافوں کے وجود میں آنے کے بعد جن حالات اور جن تقاضوں کا سامنا ہے ان پر نظر نہ کرنا اور یہی کہتے جانا کہ اکابر کے منشاء کے خلاف ہے کیا قرینِ حکمت اور جوابِ مسئولیت ہوسکتا ہے؟ کیا اکابر کے فکر ونظر اور علم وعقیدہ تبدیل کرنے کی بات ہو رہی ہے یا انہی کے استحکام وتوسیع کے لئے وسائل میں تبدیلی کا تقاضہ کیا جا رہا ہے؟ کیا یہ بھی اکابر کی مخالفت اور ان سے انحراف واختلاف ہے؟ جب کہ دنوں میں بونِ بعید اور ارض وسماء کا فاصلہ ہے، ایک ہرگز نہیں کیا جانا چاہیئے اور کبھی نہیں کیا جانا چاہیئے تو دوسرا ضرور کیا جانا چاہیئے اور ابھی کیا جانا چاہیئے، بس میں اسی کا حامی وداعی ہوں، باقی جہاں تک مدارس کے نصاب ونظام کی بات ہے جنہیں ہم اصطلاحِ مدارس میں ''علوم عالیہ'' سے تعبیر کرتے ہیں ان میں سوفی صد ایقان رکھتا ہوں کہ انہی علوم اور اسی نظامِ اکابر کی برکت ہی تو ہے جو چہار دانگِ عالم میں احقاقِ حق وابطالِ باطل کا کام ہوتا رہا، اسی نظام ونصاب کی برکت سے ''الطائفة المنصورة'' کی پیشین گوئی ہر طرف جلوہ گر ہوتی رہی تو پھر کوئی علم وعقل کا اندھا ہی اس پر تنقید یا اس کی تنقیص کرسکتا ہے؟ والعیاذ باللہ!

● ایک وضاحت یہ بھی کردوں کہ اوپر میں نے جو یہ کہا ہے کہ ''جھوٹے مدعیان دین فہمی اور نام نہاد دعاۃِ اسلام کے مقابلے میں ہم علماء مدرستی زبان اور عالمانہ فاضلانہ اصطلاحات میں اظہارِ خیال اور دعوتِ دین دیتے رہتے ہیں جو عام مسلمانوں اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ناقابلِ فہم طرز ہے'' تو یہ بھی میں صرف دعوت وتبلیغ کی حد تک کہہ رہا ہوں، باقی درس گاہوں میں اور تحقیق واستخراج کے میدان اور علمی محادثات ومحاضرات میں اس زبان اور ان اصطلاحات بلکہ بہ قدرِ ضرورت اصطلاحاتِ منطق کا منکر بھی نہیں ہوں بلکہ اس کا حامی اور وکیل ہوں، کیوں کہ ہر میدان کا کمال اور اس کے تقاضے علاحدہ ہوتے ہیں ان کو تسلیم کیا جانا اور ان پر عمل کیا جانا ضروری ہے، طلبہ وعلماء میں یہ کمال پیدا کیا جانا چاہیئے، یہ حفاظتِ دین کے کام میں ان کی ضرورت ہے اور اہم ضرورت ہے لیکن دعوت واشاعتِ دین کے میدان میں کامیابی کے لئے اُنہیں کچھ اوزار واسلحہ کی ضرورت ہے میری گفتگو صرف اسی حد تک محدود ہے۔

● رہا یہ سوال کہ یہ ضرورتیں طالبانِ علوم دین کو مدرسہ ہی میں کیوں فراہم کی جائیں؟ وہ بعد میں بھی تو دیگر جگہوں سے ان کا حصول کرسکتے ہیں تو اس کا جواب تجربات کی روشنی میں یہ ہے کہ جو طلبہ مدرسے کی تعلیم کے بعد ان علوم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ عام طور سے خدمتِ دین کے وسائل کے طور پر نہیں محسوس کرتے بلکہ صرف احساس کم تری سے مغلوب ہوکر اور وسیلۂ معاش کے طور پر اس طرف جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے چال ڈھال اور وضع قطع سے تک بغاوت کر بیٹھتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ اگر یہ کام مدرسے کے اندرون اور

دورانِ نصاب ہوگا تو شروع ہی سے ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ یہ مستقبل میں ان کی دینی ودعوتی ضرورت ہے، نہ کہ کوئی معاشی سہارا! جیسا کہ منطق وفلسفہ کو کبھی انہوں نے غیر دینی ضرورت نہیں سمجھا، کیوں کہ ماحول ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دوسری طرف دھیان نہیں جاتا، اسی طرح چند علومِ عصریہ اور زبانیں مدرسے ہی میں بڑھالی اور پڑھائی جائیں گی تو اُن علوم پر چڑھائے گئے ملمع اور آلائشوں سے پاک کر کے پڑھائی جائیں گی اور اسکولوں کالجوں کے ماحول میں ان علوم کو پڑھنے سے جو فطرتِ سلیمہ اور فہمِ صحیح متأثر ومتغیر ہوجاتی ہے اس سے تقریباً حفاظت رہے گی۔

دوسرے یہ کہ مدرسے میں ہمیں ان کی ذہن سازی کرتے رہنے اور ان علوم عصریہ کے مُضر پہلوؤں سے بچاتے رہنے کا موقعہ مل سکتا ہے کیوں کہ یہاں ان علوم کی حیثیت تابع اور معاون علم سے زیادہ نہیں ہوگی، باہر کے ماحول میں انہی علوم کا ترفُّع اور غلبے کی باتیں ہوں گی اور ایسے اساتذہ ہوں گے جن کی نظر میں علم دین ثانوی درجے کی چیز ہے یا بے وقعت ہے تو لامحالہ طالب علم اپنے راستے سے بہ آسانی بہک جائے گا۔اس لئے مدارس کے نصاب ہی میں شامل کر کے دین میں معاون علوم کی حیثیت سے پڑھانا ہی مفید مطلب ہوسکتا ہے، اس سے بعض حضرات کا یہ خطرہ بھی ٹل جائے گا کہ عالم بن جانے کے بعد کالجوں میں جانے سے علمِ دین کی تنقیص ہوتی اور اس کی وقعت دلوں میں گھٹ جاتی ہے وغیرہ۔

● اس کے باوجود بھی فراغت کے بعد چند طلبہ خدمتِ دین کا میدان چھوڑ کر معاش کی راہوں پر نکل جائیں گے تو یہ وہ خطرہ ہے جس سے اب بھی حفاظت نہیں ہے، علماء کی ایک بڑی تعداد اب بھی کارِ دین میں نہیں لگی ہوئی ہے حالاں کہ ان کی استعدادیں اس لائق تھیں کہ وہ محدث وفقیہ بن سکتے مگر فراغت کے بعد جب وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں رہ جاتے تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟

(بقیہ صفحہ ۱۷ سے)

حضرت اُمِ ایوب ؓ سے چند احادیث بھی مروی ہیں، ان کے بطن سے حضرت ابو ایوب ؓ کی جو اولاد ہوئی ان میں سے ایوب، خالد، محمد، تین بیٹوں اور ایک بیٹی عمرہ کے نام معلوم ہوئے۔

حضرت اُمِ ایوب ؓ کے سال وفات کے بارے میں کتب سیر خاموش ہیں۔(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے اسد الغابۃ، الاصابۃ، الاستیعاب، تہذیب التہذیب)

گوشۂ سیرت

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسب ونسب اعلیٰ واشرف ہے

از: مولانا خواجہ نصیرالدین قاسمی *

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمِ محترم سیدنا عباس رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے اور قوم کی شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! قریش آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو بشاشت اور خوش طبعی سے ملاقات کرتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو ناگواری کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بہت غضب ناک ہوئے:

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ تم سے اللہ اور اس کے رسول کے لئے محبت نہ کرے۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! قریش نے ایک مجلس میں اپنے حسب ونسب کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کی مثال اس کھجور کے درخت سے دی ہے جو کسی کوڑے پر اُگا ہو۔ (گویا اس میں آپ کے حسب ونسب کی توہین کی جارہی ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ حق تعالیٰ نے جس دن مخلوقات کو پیدا کیا تو مجھے ان میں سے بہترین مخلوق میں بنایا، پھر اس مخلوق کو مختلف جماعتوں میں بانٹا تو مجھے بہترین جماعت میں رکھا، پھر اس بہترین جماعت کے قبائل بنائے تو مجھے ان میں بہتر قبیلہ میں بنایا، پھر ان کے خاندان بنائے تو مجھے ان کے بہترین خاندان میں پیدا کیا تو میں ان میں نسب کے اعتبار سے بھی اعلیٰ ہوں اور خانوادہ کے اعتبار سے بھی۔ (ترمذی: ۲؍۳۵۳)

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ:

’’اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل میں سے کنانہ کو، اور کنانہ سے قریش کو چُنا، اور قریش میں سے بنو ہاشم کا اور بنو ہاشم میں میرا انتخاب فرمایا‘‘۔ (مسلم: ۲۲۷۶)

(ماخوذ از دلائل النبوۃ: ۱؍۱۳۷، ۱۳۸)

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت امِّ ایّوب انصاریہؓ رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب

اصل نام معلوم نہیں اپنی کنیت ''ام ایوبؓ'' سے مشہور ہیں۔ میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اہلیہ تھیں، ہجرت نبوی سے قبل اپنے شوہر کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اُم ایوب کے گھر میں قیام

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو سات ماہ تک حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں قیام فرمایا، اس دوران حضرت ام ایوبؓ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کھانا تیار کیا کرتی تھیں، ابتداءً حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت ابوایوبؓ کے مکان کی زیریں منزل میں مقیم تھے، ابن ہشام کا بیان ہے کہ ایک روز بالا خانے پر پانی سے بھرا ہوا برتن پھوٹ گیا، میاں بیوی اس خیال سے بے قرار ہوگئے کہ پانی بہہ کر نیچے جائے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تکلیف ہوگی، گھر میں اوڑھنے کا ایک ہی لحاف تھا، انہوں نے فی الفور یہ لحاف گھسیٹ کر پانی پر ڈال دیا تاکہ بہتا ہوا پانی لحاف میں جذب ہوجائے، جب پانی کے نیچے بہنے کا امکان نہ رہا تو میاں بیوی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''فقمت أنا وأبو ایوب بقطیفة لنا، مالنا لحاف غیرھا، ننشفُ بھا الماء، تخوفا أن یقطر علی رسول اللہ ﷺ منه شیء فیوذیه'' (سیرۃ ابن ہشام، منزلہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم من بیت أبی ایوب: ۱/۴۹۸)

ایک دن اپنے بالائی منزل میں مقیم ہونے کا احساس اس قدر شدّت اختیار کرگیا کہ دونوں میاں بیوی چھت کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئے ''فتنحوا فباتوا فی جانب'' اور ساری رات اسی حالت میں جاگ کر گزار دی صبح ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ''یارسول اللہ! ہم ساری رات چھت کے ایک کونے میں بیٹھ کر جاگتے رہے'' حضورؐ نے سبب دریافت فرمایا تو عرض کیا:

''ہمارے ماں باپ آپ پر قربان! ہر لحظہ یہ خیال سوہان روح بنا رہا کہ آپ تو زیریں منزل میں تشریف

* رفیق دارالتصنیف والارشاد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

رکھتے ہیں اور ہم بالا خانہ میں مقیم ہیں، یا رسول اللہ! آپ بالا خانے پر تشریف لے چلئے، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور حضرت ابو ایوّبؓ اور حضرت اُمِ ایوبؓ نے بکمال مسرّت نچلی منزل میں اقامت اختیار کرلی۔(دلائل النبوۃ للبیہقی، ۲/۵۰۹)

معمول یہ تھا اُمِّ ایوبؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے کھانے پکاتیں، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھانا تناول فرمالیتے تو آپ کے کھانے کے باقیات سے بطور برکت وتیمن تناول کیا کرتے تھے، ایک دفعہ کھانے میں لہسن ڈال کر پکایا، اور کھانا جب واپس آیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تناول فرمانے کی جگہ تلاش کی، جب یہ پتہ چلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھانا کھایا ہی نہیں، تو ابو ایوب انصاریؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس چلے آئے اور پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا یہ (لہسن) حرام ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: نہیں! لیکن میں لہسن کو پسند نہیں کرتا، چوں کہ میرے پاس فرشتے آتے ہیں۔(مسلم، کتاب الاشربۃ، باب إباحۃ أکل الثوم، حدیث: ۱۷۱) اور بعض روایات میں پیاز کا تذکرہ ملتا ہے۔(ترمذی کتاب الاطعمۃ، باب ماجاء فی کراہیۃ أکل الثوم والبصل، حدیث: ۱۸۰۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمّ ایوبؓ کے گھر میں ضیافت:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے خانۂ اقدس میں منتقل ہوجانے کے بعد بھی کبھی کبھی حضرت ابو ایوبؓ کے گھر تشریف لے جاتے تھے، دونوں میاں بیوی حضور کا پرتپاک خیر مقدم کرتے تھے، اور جو کچھ میسر ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کردیتے، ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھوک کی حالت میں خانہ اقدس سے باہر نکلے، راستے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ مل گئے، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابوایوبؓ کے گھر رونق افروز ہوئے، اس وقت حضرت ابو ایوبؓ اپنے مکان سے متصل کھجوروں کے باغ میں تھے، اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی، حضرت ام ایوبؓ نے حضورؐ کو اہلاً وسہلاً کہا، حضورؐ نے پوچھا: ''ابو ایوبؓ کہاں ہے؟ حضرت ابو ایوبؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آواز سنی تو کھجوروں کا ایک گچھا توڑ کر دوڑے ہوئے گھر آئے اور یہ گچھا مہمانانِ کرام کی خدمت میں پیش کیا، اس کے ساتھ ہی فوراً ایک بکری ذبح کی، حضرت اُمِ ایوبؓ نے آدھے گوشت کا سالن پکایا، آدھے کے کباب بنائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں رکھ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک روٹی پر کچھ گوشت رکھ کر فرمایا ''اسے فاطمہ کو بھیج دو اس پر کئی دن کا فاقہ ہے''، ''أبلغ بھذا فاطمة، فإنها لم تصب مثل هذا منذ ايام''، حضرت ابو ایوبؓ نے تعمیل ارشاد کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے رفقاء کرام کے ساتھ کھانا کھایا، قیاس یہ ہے کہ حضرت اُمِ ایوبؓ نے کئی اور موقعوں پر بھی اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت کی ہوگی۔(صحیح ابن حبان، ذکر الامر بتحمید اللہ عند الفراغ من الطعام، حدیث: ۵۲۱۶)۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ: ۱۴ پر)

تذکارِ صحابہؓ

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت زبیرؓ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھوپی زاد بھائی، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے برادرزادے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے داماد تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما کے حالاتِ زندگی میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں ''السابقون الاولون'' میں سے تھے، دونوں ''عشرۂ مبشرہ'' میں سے تھے، دونوں ہم عمر اور ہم عصر تھے، دونوں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے داماد تھے، دونوں ''اصحابِ شوریٰ'' یعنی ان چھ جلیل القدر شخصیات میں شامل تھے جنہیں حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے بعد خلافت کے منصب کے لئے منتخب فرمایا تھا، دونوں کی ایک ہی واقعے میں بصرہ کے قریب ایک جیسے حالات میں شہادت ہوئی حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر ان دونوں کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا: طَلحَۃُ وَالزُّبَیرُ جَارَايَ فِي الجَنَّۃِ یعنی طلحہ اور زبیر دونوں جنت میں میرے پڑوسی ہیں۔ (ترمذی)

سوانحی نقوش:

مکہ مکرمہ میں قریش کے کئی قبیلے آباد تھے، جن میں ایک معزز قبیلہ بنو اسد کا تھا، اس قبیلہ میں عوام بن خویلد کا خاندان شرافت ونجابت میں مشہور تھا، عوام حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے حقیقی بھائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر تھے۔ حضرت زبیرؓ نے اسی گھرانے میں آنکھیں کھولی۔

آپ کا نام نامی زبیر اور کنیت ابوعبداللہ ہے، آپ کا نسب والد کی جانب سے اس طرح ہے: زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر۔ اور والدہ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہے: زبیر بن صفیہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی۔ آپ کی والدہ حضرت صفیہ اور آپ کے والد عوام کا نسب قصی بن کلاب پر جا کر مل جاتا ہے۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی ولادت مکہ شہر میں ہوئی، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ''محمد'' اکثر یوں کہا کرتے تھے کہ ''میرے والد طلحہ نیز زبیر بن العوام، علی بن ابی طالب، اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی ولادت مکہ شہر میں ایک ہی

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

سال ہوئی تھی‘‘، یعنی ولادت کے لحاظ سے یہ تمام حضرات ہم عمر تھے۔

حضرت زبیر بن عوام کشیدہ قامت تھے، رنگ گندمی تھا، آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں خاص قسم کی چمک تھی، چہرے کی ساخت میں وجاہت تھی اور اس پر فطری رعب چھایا رہتا تھا، سر کے بال گھنے اور داڑھی ہلکی تھی جس میں زیادہ گھنا پن نہ تھا۔ (اصحاب الرسول: ۲۰۷) حضرت زبیرؓ نے مختلف اوقات میں متعدد خواتین سے نکاح فرمایا؛ جن سے گیارہ لڑکے اور نو لڑکیاں تولد ہوئیں۔

آپ کا ابتدائی ذریعۂ معاش زراعت تھا، پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تجارت کے فضائل سن کر آپ نے بھی اعلیٰ پیمانے پر تجارت کا آغاز کر دیا، مورخین کے مطابق آپ ’’ایک بول اور ایک تول‘‘ کے اصول پر عمل پیرا تھے؛ اس لیے کبھی عمر بھر نقصان اور گھاٹے کی نوبت نہیں آئی۔ (الاستیعاب: ۱/ ۲۰۸)

فضائل و مناقب:

حضرت زبیرؓ ان دس خوش نصیب صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کو دنیا ہی میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنتی ہونے کی خوش خبر سنائی تھی۔ اس کے علاوہ احادیث میں حضرت زبیر کے متعدد فضائل منقول ہیں، حتی کہ حضرات محدثینؒ آپ کے فضائل کے لیے مستقل باب اپنی کتابوں میں قائم کرتے ہیں، رئیس المحدثین امام بخاریؒ نے بھی حضرت زبیرؓ کے فضائل کو مستقلاً باب میں ذکر کیا ہے۔ غزوہ خندق کے موقع پر آپ علیہ السلام نے فرمایا: ’’لکل نبی حواری وحواری الزبیر‘‘ (مسلم) ہر نبی کا ایک حواری (خاص مددگار، ناصر) ہوتا ہے، میرا حواری زبیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (میرے ماں باپ آپ پر قربان) کے لیے ’’فداک امی وابی‘‘ بے شمار لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن حضرت زبیرؓ وہ خوش قسمت ترین انسان ہیں جن کے لیے فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فداک ابی و امی (میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں) فرمایا۔ اور جنگ بدر کے دن حضرت زبیر کی لڑائی اللہ کو اتنی پسند آئی کہ روایت میں آتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنگ بدر کے دن حضرت جبریل پیلا عمامہ باندھے ہوئے حضرت زبیرؓ کی شکل وصورت میں فرشتوں کی فوج لے کر اترے تھے۔ (کنز العمال جلد ۲، ص: ۱۲۷)

قبول اسلام اور ہجرت:

حضرت زبیرؓ نے سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کرلیا، آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسلام لانے کے چار پانچ روز بعد مسلمان ہوئے تھے، اس لیے آپ کا شمار السابقون الاولون میں ہوتا ہے، اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت زبیرؓ کو قریش کی طرف سے سخت تکالیف اور مظالم ومصائب کا سامنا کرنا پڑا؛ لیکن اس وقت ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، آپ کا چچا آپ کو کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر ناک اور آنکھ میں دھواں دیتا مگر

اس کے باوجود آپ نے اسلام سے روگردانی نہیں کی، جب ایک موقع پر افواہ پھیلی کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذاء دی ہے، اور قید کرلیا ہے، تو حضرت زبیرؓ جوش میں آگئے، اور تلوار لے کر کفار کے مجمع میں گھس گئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچ گئے۔

حضرت زبیرؓ کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: زبیر! کیا بات ہے؟

عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے بتایا گیا تھا کہ کفار نے آپ کو اذیت دی ہے۔ میں آپ کے دفاع کے لیے نکلا ہوں۔

یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے۔ ان کی جاں نثاری کی تعریف کی اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔ گویا اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت و دفاع میں جو تلوار سب سے پہلے اٹھی وہ حضرت زبیر بن عوامؓ کی تلوار تھی۔

جب کفار مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور پورے بنی ہاشم کا معاشرتی بائیکاٹ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا تو اس صبر آزما اور جاں گسل عرصے کے دوران بھی حضرت زبیرؓ نے رضا کارانہ طور پر مقاطعے اور فقر و فاقہ کی تکلیفیں برداشت کیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا اور مشکلات و مصائب سے گھبرا کر دین اسلام کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

مسلمانوں پر مشرکین کے مظالم جب حد سے بڑھ گئے تو سن ۵ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل اسلام کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت عطا فرمائی۔ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں میں حضرت زبیر بن عوامؓ بھی شامل تھے۔ یہ آپ کی پہلی ہجرت تھی جو آپ نے اللہ کی راہ میں کی تھی۔ اس کے بعد آپ کی دوسری ہجرت مدینے کی طرف ہوئی۔ اس طرح حضرت زبیر بن عوامؓ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو مرتبہ ہجرت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

غزوات میں شرکت:

ہجرتِ مدینہ کے بعد جلد ہی جب غزوات کی نوبت آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے، ہر غزوے کے موقع پر حضرت زبیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیرِ قیادت شریک؛ بلکہ پیش پیش رہے، اور شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھاتے رہے۔ سب سے پہلے غزوۂ بدر پیش آیا، حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں نہایت جانبازی و دلیری کے ساتھ حصہ لیا، جس طرف نکل جاتے تھے غنیم کی صفیں تہ و بالا کر دیتے تھے، ایک مشرک نے ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر مبارزت چاہی، حضرت زبیرؓ بڑھ کر اس سے لپٹ گئے، اور دونوں قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان دونوں میں جو سب سے

پہلے زمین پر گرے گا وہ مقتول ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ مشرک پہلے زمین پر گر کر حضرت زبیرؓ کے ہاتھ سے واصلِ جہنم ہوا۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمان اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے تھے، اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی، مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور سب شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار تھے، ایسے میں جنگ کے خاتمے کے فوری بعد مسلمانوں کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ ہماری اس کیفیت اور شکست وریخت کو محسوس کرتے ہوئے ایسا نہ ہو کہ مشرکینِ مکہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر دوبارہ ہم پر حملہ آور ہو جائیں؛ لہٰذا اس چیز کے سدِ باب کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشاورت اور غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ فرمایا کہ مسلمانوں کا ایک دستہ مشرکینِ مکہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا جائے تاکہ ان پر خوف طاری ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان جس جسمانی ونفسیاتی کیفیت سے دوچار تھے، اور جس طرح انہیں شکست وریخت کا سامنا تھا، وہ سبھی زخموں سے چور تھے، ایسے میں اب دوبارہ اسی دشمن کے تعاقب میں نکل کھڑے ہونا بہت دل گردے کا کام تھا؛ لیکن بہرحال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس چیز کا فیصلہ فرما ہی لیا تو اب ستر مسلمانوں کا ایک دستہ فوری طور پر تیار کیا گیا اور اس کی قیادت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا، چنانچہ یہ دستہ اُحد کے میدان سے ہی فوری طور پر مشرکینِ مکہ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ مشرکین نے جب مسلمانوں کے اس دستے کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھا تو وہ مسلمانوں کی ہمت وشجاعت اور عزیمت واستقامت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر جب کہ نہایت خوف ناک صورت حال تھی، یہودِ مدینہ کے ناپاک عزائم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ودیگر تمام مسلمان آگاہ ہو چکے تھے، ایک طرف خندق کے اُس پار صف آرا بیرونی دشمن کی طرف سے کسی بھی وقت بڑا حملہ متوقع تھا، دوسری طرف خود مدینہ شہر کے اندر اِن خفیہ دشمنوں کی طرف سے زبردست جارحیت کا اندیشہ تھا، ایسے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان فرمایا: ’’ہے کوئی جو مجھے بنوقریظہ کے بارے میں خبر لا کر دے؟‘‘ اس پر حضرت زبیرؓ نے عرض کیا ’’اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں!‘‘

چونکہ یہ کام بہت زیادہ خطرناک تھا، تنہا خفیہ طور پر بنوقریظہ کے محلے میں جانا، وہاں صورتِ حال کا جائزہ لینا، کسی بھی طرح ان کے عزائم اور خفیہ منصوبوں کی کھوج لگانا، اور پھر اسی طرح چھپتے چھپاتے وہاں سے واپس آنا (مزید اتفاق یہ کہ وہ رات بھی انتہائی بھیانک تھی، اندھیرا بہت زیادہ تھا، ہر طرف تیز طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، سردی انتہائی عروج پر تھی) یہی وجہ تھی کہ ایسے میں یہ کام انجام دینا بہت جان جوکھوں کا کام تھا؛

لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استفسار پر جب حضرت زبیرؓ نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے خود کو اس کام کے لئے پیش کیا، تو اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا یہی سوال دہرایا، دوسری بار بھی وہاں موجود تمام افراد میں سے حضرت زبیرؓ نے ہی جواب دیا کہ ''میں حاضر ہوں''۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیسری بار یہی سوال دہرایا، تب تیسری بار بھی حضرت زبیرؓ نے ہی جواب دیا کہ ''میں حاضر ہوں''۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ضروری ہدایات دے کر بنو قریظہ کی جانب روانہ فرمایا، اور اس موقع پر آپؐ نے یہ یادگار ترین الفاظ ارشاد فرمائے: ''ہر نبی کا ایک حواری ہوا کرتا ہے، اور میرے حواری زبیر ہیں''۔

حضرت زبیر عہد نبوی کے بعد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو وہی بلند ترین مقام و مرتبہ حاصل رہا اور اس وقت بھی ان کی وہی قدر و منزلت برقرار رہی، خلیفۂ اول کے مشیرِ خاص اور انتہائی قریبی دوست کی حیثیت سے انہیں دیکھا جاتا رہا، پھر خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی ان کی یہی حیثیت اور نمایاں شان برقرار رہی، حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قاتلانہ حملے کے نتیجے میں جب شدید زخمی ہو گئے، بچنے کی امید کم تھی، تب اکابرِ صحابہؓ میں سے متعدد شخصیات نے یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیر المؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کر دیجئے'' اس پر حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کے لیے منتخب کر لیں، ان چھ افراد میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ (اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ۲۱۸)

شہادت:

۳۵ھ میں باغیوں اور شر پسندوں نے جب خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا، پھر انہی باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا اور عرصۂ دراز تک اس المناک واقعے کے بھیانک نتائج و اثرات مختلف فتنوں کی شکل میں مسلسل ظاہر ہوتے رہے۔

حضرت زبیر بن عوامؓ کی شہادت بھی اسی سلسلے میں ہونے والی ایک جنگ (جمل) کے دوران ہوئی۔ اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشاجرات اقتدار کے حصول اور مال و دولت کے لیے نہیں تھے، بلکہ ان میں ہر فریق اللہ کی رضا کے لیے میدان میں اُترا تھا۔ حضرت زبیرؓ ابتداء میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لشکر میں تھے، لیکن جب حضرت علیؓ سے سامنے ہوا، تو حضرت علیؓ نے کہا کہ اے زبیر!

کیا تم کو وہ دن یاد ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا کہ تم ایک شخص سے لڑو گے اور تم اس پر ظلم کرنے والے ہوگے؟ یہ سن کر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ ہاں مجھ کو یاد آ گیا، لیکن آپ نے میری روانگی سے قبل مجھ کو یہ بات یاد نہ دلائی، ورنہ میں مدینہ سے کبھی نہ نکلتا۔ اور اب واللہ! میں آپ سے ہرگز نہ لڑوں گا۔ پھر زبیرؓ میدان جنگ سے علیحدہ ہو گئے، واپسی پر عمرو بن جرموز نے دھوکہ سے حالتِ سجدہ میں انہیں شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جب یہ قاتل حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت علیؓ نے فرمایا اس کو آنے کی اجازت دے دو اور ساتھ ہی جہنم کی بشارت بھی سنا دو۔ اس قاتل کے ہاتھ میں حضرت زبیر کی تلوار تھی، تلوار دیکھ حضرت علیؓ نے فرمایا: اے ظالم! یہ وہ تلوار ہے جس نے عرصہ دراز تک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کی۔ جب قاتل نے یہ الفاظ سنے تو حضرت علیؓ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہہ کر تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی، اس طرح یہ قاتل جہنم واصل ہوا۔

علمِ حقیقی کی علامت خشیت اللہ ہے

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب علمِ حقیقی کی علامت خشیت اللہ ہے تو ہر عالم اور طالب علم کو بار بار اپنا جائزہ لینا چاہیئے کہ یہ علامت اس میں پیدا ہوئی یا نہیں؟ اور مثال دے کر فرماتے کہ جب کوئی مسافر ریل گاڑی میں سوار ہو کر کسی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو وہ بار بار کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھتا ہے کہ اب کونسا اسٹیشن آیا ہے؟ اگر وہی اسٹیشن راستے میں پڑ رہے ہیں جو منزل مقصود کے راستے میں آیا کرتے ہیں تو مطمئن ہو جاتا ہے، اور انہی اسٹیشنوں سے اندازہ لگاتا ہے کہ منزل کتنی دور ہے؟ اور اگر اسٹیشن ایسے نامانوس آنے لگیں جو اس منزل کے راستے میں نہیں پڑتے تو سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی کسی اور رُخ پر جا رہی ہے اور گھبرا کر گاڑی بدلنے کی فکر کرتا ہے، اسی طرح علم کے مسافر کو بار بار اپنے دل کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ ’’خشیت اللہ‘‘ کا اسٹیشن آیا یا نہیں؟ اگر اس اسٹیشن کے کچھ آثار معلوم ہوتے ہیں تو سفر صحیح سمت میں ہو رہا ہے لیکن اگر خشیت، تواضع، انابت الی اللہ اور اتباعِ سنت کے بجائے بے فکری، تکبر وانانیت، حب جاہ ومال اور نفس پرستی کے اسٹیشن آ رہے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کسی غلط گاڑی میں سوار ہے اور یہ گاڑی اسے علم کی اس منزل تک نہیں پہونچا سکتی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلوب ہے۔ (میرے والد میرے شیخ: ۱۳۸)

گوشۂ رمضان

روزہ کے چند اہم بنیادی مقاصد

مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی

روزہ کا پہلا مقصد: تقویٰ

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: یا أیہا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

قرآن کریم کے اس اعلان کے مطابق روزہ کی فرضیت کا بنیادی مقصد لوگوں کی زندگی میں تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ تقویٰ اصل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے خوف ورجاء کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کے مطابق ممنوعات سے بچنے اور اوامر پر عمل کرنے کا نام ہے۔ روزہ سے خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی تقویٰ یعنی اللہ کے خوف کی بنیاد ہے۔ روزہ کے ذریعہ ہم عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے خالق، مالک ورازق کائنات کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے والے بن سکتے ہیں۔ اگر ہم روزہ کے اس اہم مقصد کو سمجھیں اور جو قوت اور طاقت روزہ دیتا ہے اس کو لینے کے لئے تیار ہوں اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوف خدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشوونما دینے کی کوشش کریں تو ماہ رمضان ہم میں اتنا تقویٰ پیدا کرسکتا ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی گیارہ مہینوں میں زندگی کی شاہراہ پر خاردار جھاڑیوں سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے چل سکیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو روزہ کے اس اہم مقصد کو اپنی زندگی میں لانے والا بنائے۔ آمین۔

روزہ کا دوسرا مقصد: گناہوں سے مغفرت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: جس نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے یعنی خالصۃً اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے روزہ رکھا اس کے گزشتہ تمام (چھوٹے) گناہ معاف فرمادئے جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے: جو ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے یعنی ریا، شہرت اور دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے رات میں اللہ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوا یعنی نماز تراویح اور تہجد پڑھی تو اس کے گزشتہ تمام (چھوٹے) گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے: حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے عبادت کے لئے کھڑا ہوا یعنی نماز تراویح وتہجد پڑھی، قرآن کی تلاوت فرمائی اور اللہ کا ذکر کیا تو اس کے گزشتہ تمام (چھوٹے) گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ منبر کے قریب ہوجاؤ، صحابۂ کرامؓ قریب ہوگئے۔ جب حضور اکرم ﷺ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم مبارک رکھا تو فرمایا آمین۔ جب دوسرے درجہ پر قدم مبارک رکھا تو فرمایا آمین۔ جب تیسرے درجہ پر قدم مبارک رکھا تو فرمایا آمین۔ جب آپ ﷺ خطبہ سے فارغ ہوکر نیچے اترے تو صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہم نے آج آپ سے منبر پر چڑھتے ہوئے ایسی بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے آئے تھے۔ جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوسکی، میں نے کہا آمین۔ پھر جب دوسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر مبارک ہوا اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا آمین۔ جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہونچے اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کراسکیں، میں نے کہا آمین۔ (بخاری، صحیح ابن حبان، مسند حاکم، ترمذی، بیہقی) غرضیکہ کس قدر فکر اور افسوس کی بات ہے کہ ماہ مبارک کے قیمتی اوقات بھی غفلت اور معاصی میں گزار دئے جائیں جس سے سابقہ گناہوں کی مغفرت بھی نہ ہوسکی۔ لہذا ہمیں رمضان کے ایک ایک لمحہ کی حفاظت کرنی چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم حضرت جبرئیل علیہ السلام اور حضور ﷺ کی اس دعا کے تحت داخل ہوجائیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو روزہ کے ثمرات میں بجز بھوکا رہنے کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو رات کے جاگنے کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ (سنن ابن ماجہ) یعنی روزہ رکھنے کے باوجود دوسروں کی غیبت کرتے رہتے ہیں یا گناہوں سے نہیں بچتے یا حرام مال سے افطار کرتے ہیں۔ لہذا ہمیں ہر ہر عمل خیر کی قبولیت کی فکر کرنی چاہئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا یہ شبِ مغفرت شبِ قدر ہی تو نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں! بلکہ دستور یہ ہے کہ مزدور کا کام ختم ہوتے ہی اسے مزدوری دے دی جاتی ہے۔معلوم ہوا کہ ہمیں عید کی رات میں بھی اعمال صالحہ کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے تا کہ رمضان میں کی گئی عبادتوں کا بھرپور اجروثواب مل سکے۔

روزہ کا تیسرا مقصد: قرب الٰہی

روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہوتا ہے۔روزہ کے متعلق حدیث قدسی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں خود ہی روزہ کا بدلہ ہوں۔(صحیح بخاری) اس سے زیادہ اللہ کا کیا قرب ہوگا کہ اللہ جل شانہ خود ہی روزہ کا بدلہ ہے۔نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخص کی دعا رد نہیں ہوتی ہے، ان تین اشخاص میں سے ایک روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر رحمت نازل فرماتے ہیں۔(صحیح ابن حبان)

روزہ کا چوتھا مقصد: عنداللہ اجر عظیم کا حصول

اس برکتوں کے مہینہ میں ہر نیک عمل کا اجروثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر عمل خیر کا دنیا میں ہی اجر بتادیا کہ کس عمل پر کیا ملے گا؟ مگر روزہ کے متعلق حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا۔ بلکہ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں خود ہی روزہ کا بدلہ ہوں۔اللہ اللہ کیسا عظیم الشان عمل ہے کہ اس کا بدلہ ساتوں آسمانوں وزمینوں کو پیدا کرنے والا خود عطا کرے گا یا وہ خود اس کا بدلہ ہے۔روزہ میں عموماً ریا کا پہلو دیگر اعمال کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزہ کو اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا الصَّوْمُ لِی روزہ میرے لئے ہے۔

لہذا ہمیں ماہ رمضان کی قدر کرنی چاہئے کہ دن میں روزہ رکھیں، پنج وقتہ نماز کی پابندی کریں کیونکہ ایمان کے بعد سب سے زیادہ تاکید قرآن وحدیث میں نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت بھی نماز کے اہتمام کی ہی ہے۔کل قیامت کے دن سب سے پہلا سوال نماز ہی کے متعلق ہوگا۔نماز تراویح پڑھیں اور اگر موقع مل جائے تو چند رکعات رات کے آخری حصہ میں بھی ادا کرلیں۔فرض نمازوں کے علاوہ نماز تہجد کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے قرآن کریم میں متعدد مرتبہ فرمایا ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں تہجد پڑھنے کا اہتمام کریں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال کی روشنی

میں امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ ''لیلۃ القدر'' رمضان کے آخری عشرہ میں پائی جاتی ہے جس میں عبادت کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ہزار مہینوں یعنی پوری زندگی کی عبادت سے زیادہ افضل قرار دیا ہے۔ اسی اہم رات کی عبادت کو حاصل کرنے کے لئے ۲ ہجری میں رمضان کے روزے کی فرضیت کے بعد سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مبارک ماہ کی قدر کرنے والا بنائے اور شب قدر میں عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جس طرح ہم روزہ میں کھانے پینے اور جنسی شہوت کے کاموں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے رکے رہتے ہیں اسی طرح ہماری پوری زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے مطابق ہونی چاہئے، ہماری روزی روٹی اور ہمارا لباس حلال ہو، ہماری زندگی کا طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام والا ہوتا کہ ہماری روح ہمارے جسم سے اس حال میں جدا ہو کہ ہمیں، ہمارے والدین اور سارے انس وجن کا پیدا کرنے والا ہم سے راضی وخوش ہو۔ دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کے وقت اگر ہمارا مولا ہم سے راضی وخوش ہے تو ان شاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی ہمارے لئے مقدر ہوگی کہ اس کے بعد کبھی بھی ناکامی نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ماہ مبارک میں زیادہ سے زیادہ اپنی عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور رمضان کے صیام وقیام اور تمام اعمال صالحہ کو قبول فرمائے۔ رمضان کے بعد بھی منکرات سے بچ کر احکام خداوندی کے مطابق یہ فانی وعارضی زندگی گزارنے والا بنائے۔ آمین، ثم آمین۔

گوشۂ رمضان

تلاوت قرآن کریم اور ماہ رمضان المبارک

مولانا ندیم احمد انصاری*

اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانی کتابیں رمضان المبارک میں نازل فرمائی ہیں اور قرآنِ کریم بھی اسی ماہ میں نازل کیا گیا۔ ارشادِ ربانی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ۔ اس لیے اس مہینے کو کلام اللہ سے خاص مناسبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کے بابرکت ماحول میں ہر مسلمان رات دن تلاوتِ کلام پاک میں منہمک نظر آتا ہے اور الحمدللہ صرف رمضان کے مہینے میں پوری دنیا میں جتنا قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے، شاید سال بھر میں اتنا نہ پڑھا جاتا ہوگا۔ اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ دل کی صفائی، ایمانی کیفیت میں زیادتی اور انسان میں استقامت کی صفات پیدا کرنے میں سب سے زیادہ پُراثر اور اہم ترین عمل، قرآنِ کریم کی تلاوت ہے۔ اس لیے وہ حضرات جنھیں اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے، ان کی زندگی میں تلاوت میں اشتغال سب سے زیادہ نظر آتا ہے اور فطری طور پر رمضان المبارک آتے ہی یہ شوق روز افزوں ہوجاتا ہے۔

تمام آسمانی کتابیں رمضان میں نازل ہوئیں

عموماً اللہ جل شانہ کی تمام کتابیں، اسی ماہ (رمضان المبارک) میں نازل ہوئی ہیں۔ چناں چہ قرآن پاک، لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر، تمام کا تمام، اسی ماہ میں نازل ہوا اور وہاں سے حسب موقع تھوڑا تھوڑا ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو صحیفے اسی ماہ کی ۱/ یا ۳/ تاریخ کو عطا ہوئے اور حضرت داود علیہ السلام کو زبور ۱۸/ یا ۱۲/ رمضان کو ملی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت ۶/ رمضان المبارک کو عطا ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل ۱۲/ یا ۱۳/ رمضان کو ملی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے تلاوت کی کثرت اس مہینہ میں منقول ہے اور مشائخ کا معمول۔ (فضائل رمضان) حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صحفِ ابراہیم علیہ السلام رمضان کی تیسری تاریخ میں، تورات چھٹی تاریخ میں، انجیل تیرھویں تاریخ میں، زبور اٹھارھویں تاریخ میں اور قرآنِ کریم چوبیس تاریخ میں نازل ہوا۔ (الغنیۃ، مسند احمد)

* ڈائرکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا

قرآن کے بارے میں سوال کیا جائے گا

یہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم کے لیے بڑے شرف کی چیز ہے اور عنقریب اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ ارشاد ربانی ہے: (مفہوم) یقیناً یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم کے لیے بڑے شرف کی چیز ہے اور عنقریب تم سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ (سورہ زخرف: ۴۴) اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ قرآن کریم سے متعلق امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا جائے گا۔ معلوم ہوا ہر مسلمان پر قرآن سے وابستہ چند حقوق ہیں، جن کا ادا کرنا لازم وضروری ہے، من جملہ ان کے قرآنِ کریم کی تلاوت بھی ہے۔

تلاوت کا حکم خود قرآن میں

بعض لوگ تلاوتِ قرآنِ کریم کو معمولی اور بے فائدہ چیز سمجھتے ہیں، جب کہ اس کے ایک ایک حرف کی تلاوت پر عظیم اجر وثواب کے وعدے ہیں، یہاں مختصراً عرض ہے؛ تلاوت قرآن سے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: (مفہوم) (اے پیغمبر!) جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے، اس کی تلاوت کرو۔ (سورۂ عنکبوت) ایک مقام پر ارشاد ہے: (مفہوم) جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز کی پابندی رکھی ہے اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے، اُس میں سے وہ (نیک کاموں میں) خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں، جو کبھی نقصان نہیں اٹھائے گی، ان کے اعمال کا انھیں پورا اجر و ثواب دیا جائے گا۔ (سورۂ فاطر) اسی لیے ہمارے اسلاف نے قرآنِ کریم کی تلاوت کو اپنے رات ودن کا مشغلہ اور اپنے دلوں کی بہار بنالیا تھا لیکن امت رفتہ رفتہ اس عظیم نعمت سے محروم ہوتی جارہی ہے۔

فضائل تلاوتِ قرآنِ کریم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: (۱) جس نے رات کے وقت میں دس آیتیں پڑھ لیں، اسے غافلوں میں نہیں لکھا جائے گا۔ (حاکم) (۲) جو شخص کسی رات میں دس آیتیں پڑھ لے، اس کے لیے ایک قنطار لکھ دیا جاتا ہے اور (جانتے ہو قنطار کیا ہے؟) قنطار دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے، ان سب سے بہتر ہے۔ (مجمع الزوائد) (۳) (ہمیشہ) قرآن پڑھنے والا، بڑھاپے کے ضعف اور ناکارہ ہوجانے سے محفوظ رہے گا۔ (الترغیب والترہیب) (۴) نماز میں قرآن کی تلاوت؛ خارجِ نماز تلاوت سے افضل ہے اور خارجِ نماز میں قرآن کی تلاوت؛ تسبیح و تکبیر سے افضل ہے اور تسبیح؛ صدقہ سے افضل ہے اور صدقہ؛ روزہ سے افضل ہے، اور روزہ؛ جہنم کی آگ سے

ڈھال ہے۔(کنز العمال)(۵)تم لوگ اللہ تعالیٰ کا قُرب اس سے زیادہ کسی چیز سے حاصل نہیں کر سکتے، جو خود اللہ تعالیٰ سے نکلی ہے؛ یعنی قرآنِ کریم۔(مستدرک حاکم)(۶) قرآن کریم کی تلاوت اور(مختلف طریقے سے) اللہ کے ذکر کا اہتمام کیا کرو، ایسا کرنے سے آسمانوں میں تمہارا ذکر ہوگا اور یہ عمل زمین میں تمہارے لیے (ہدایت کا) نور ہوگا۔(شعب الایمان)

ماہِ رمضان میں تلاوت کا ثواب

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ ماہِ رمضان میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے یعنی جو عمل بھی ماہِ رمضان میں کیا جائے، وہ غیرِ رمضان کے عمل سے ستر گنا زیادہ ہوتا ہے۔پس اگر کوئی رمضان المبارک کے مہینے میں ایک حرف کی تلاوت کرے تو اسے اس کے بدلے سات سو نیکیاں ملیں گی اور اگر کوئی مسجدِ حرام میں اس مبارک مہینے میں ایک حرف کی تلاوت کرے گا، اسے ستر لاکھ نیکیاں ملیں گی اور جو شخص پورا قرآن وہاں ختم کر لے، اس کا ثواب ۳۳ کھرب، ۸۵/ارب اور ۱۸/کروڑ ہوجائے گا (مستفاد فضائلِ حفظِ قرآن)

آدابِ تلاوت

قرآنِ کریم کلامِ الٰہی ہے اور ظاہر ہے کلام الملوک ملوک الکلام۔اس لیے اس کا نہایت احترام لازم ہے اور اس کی تلاوت کے بہت سے آداب ہیں۔من جملہ ان کے چند حسبِ ذیل ہیں:(۱) تلاوت میں اخلاص پیدا کرنا۔(۲) اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت وارادہ رکھنا اور اس کے علاوہ کوئی فاسد ارادہ ریا وغیرہ کا ہرگز نہ ہونا۔(۳) قرآنِ کریم کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ کرنا۔(۴) اپنے ذہن میں یہ استحضار رکھنا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناجات وہم کلامی میں مشغول ہے۔(۵) دل میں یہ سوچنا کہ ربِ کائنات کی عظیم کتاب کی تلاوت کر رہا ہوں، اس حال میں کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔(۶) اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہوتو اتنا ہرگز فراموش نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں۔(۷) اپنے پاس موجود، اچھا لباس پہن کر تلاوت کرنا۔(۸) اگر ممکن ہو تو قبلہ رخ ہو کر تلاوت کرنا۔(۹) دل جمعی اور غور وفکر کے ساتھ تلاوت کرنا۔(۱۰) جنت وغیرہ سے متعلق آیات پر جنت کی طلب کرنا اور جہنم وغیرہ سے متعلق آیات پر اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہنا۔(۱۱) تلاوت سے قبل منہ کو مسواک اور کلی وغیرہ سے صاف کر لینا۔(۱۲) حتی الامکان اچھی آواز سے تلاوت کرنا۔(۱۳) ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرنا۔(۱۴) (عام دنوں میں) تین دن سے کم میں پورا قرآن کریم ختم نہ کرنا۔(۱۵) رمضان المبارک میں اور دِنوں سے زیادہ تلاوت کرنا۔(دیکھیے کتاب الاذکار، ہندیہ،شعب الایمان بیہقی)

گوشۂ رمضان

دعا ــــــ آداب واحکام

مولانا انصاراللہ قاسمی*

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :’’واللہ الغنی وانتم الفقراء‘‘ (محمد:۳۸)اللہ تعالیٰ غنی و بے نیاز ہیں اورتم وفقیر ومحتاج ہو،ظاہرسی بات ہے جب ہم فقیراورمحتاج ہیں توہمیں اپنی ضرورتوں کی تکمیل، مصیبتوں سے چھٹکارااورآزمائشوں سے نجات پانے کے لئے اپنے پروردگارو پالنہار کے دربار میں بصدعجزو نیاز رجوع ہونے کےعلاوہ کوئی دوسراطریقۂ کاراور چارۂ کارنہیں ہے،دنیا کا کوئی کتناہی امیرترین اورطاقتورشخص کیوں نہ ہو،مصیبت وامتحان کے وقت اُس کو خدا ضرور یادآتاہے،اللہ تعالیٰ کے دربار میں رجوع ہونے کی کیفیت اورحالت کو دین وشریعت کی اصطلاح میں ’’دعا‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے،بارگاہِ الٰہی میں دعا کی قبولیت کے کچھ آداب واحکام بھی ہیں۔

بارگاہ خداوندی میں دعا کے قبول ہونے کے لیے یہ بات انتہائی اہم اورضروری ہے کہ وہ مناسب سلیقہ اوربہتر طریقہ سے کی جائے،دعا میں کیا مانگنا چاہیے؟ اورکیسے مانگنا چاہیے؟ اس کی ہدایات احادیث میں جابجاملتی ہیں،اس لیے کہ دنیا میں ایک معمولی عہدیدار، افسر اورصاحبِ منصب کے یہاں اپنی کسی ضرورت سے پہونچنا ہوتوضرورت مند پہلے اپنے’’حواس خمسہ‘‘ کویکجااورمنجمد کرتاہے،اپنے حرکات وسکنات کومکمل قابو میں رکھتاہے کہ مبادا کھجلانے، انگلیاں چٹخانے اور اِدھر اُدھر نظر دوڑانے وغیرہ ایسی کوئی حرکت سرزد نہ ہوجائے جو ’’مزاجِ شاہانہ‘‘ کوگراں اورناگوارگزرے،اسی طرح تحریری طور پراگرکوئی عرض معروض کا موقع ہوتو،پیش کی جانے والی درخواست میں الفاظ کےنوک وپلک اور بال وپر درست اورٹھیک کیے جاتے ہیں،آداب والقاب پر ایک سے زائد مرتبہ نظرثانی ہوتی ہے،ہاتھ سے لکھنے کے بجائے کمپوزنگ کی جاتی ہے،اس پربھی اگراطمینان نہ ہوتو ماہرخوشنویس کوزحمتِ کتابت دی جاتی ہے،آخرمیں ’’مزاجِ خسروانہ‘‘اور’’ذوقِ لطیف‘‘ کی بھرپوررعایت اور پابندی کرتے ہوئے درخواست کوخوشنما بیل بوٹوں سے سجایااورسنوارا جاتاہے،.......... خدائے بزرگ وبرترجواحکم الحاکمین ہے،کل کائنات کاتنہامالک ہے،جیسے اپنی ذات میں اکیلاہے،ایسے ہی اپنی عظیم ترسلطنت،

* منتظم مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا

حکومت وفرماں روائی میں یکتا ویگانہ ہے،اس کی عظیم بارگاہ اور دربارِ عالی سے رجوع کے وقت بندۂ مؤمن پر لازم ہے کہ جھکاؤ اور بچھاؤ کی آخری کیفیت اختیار کرے،تواضع وانکساری، عاجزی وفروتنی اور غلامی کی انتہائی حالت جس کے بعد غلامی کا تصور ہی نہیں اس کو وہ ظاہر کرے۔

اللہ عزوجل کے بعد کائنات کی مقدس ترین ہستی آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، کائنات کی یہ افضل وبلند ترین ہستی ﷺ خدا کی بارگاہ میں دعا کے لیے جب ہاتھ اٹھاتی تو زبانِ مبارک سے نکلنے والے ذلت ومسکنت کے الفاظ اور عاجزی وانکساری کے کلمات سے عرشِ الٰہی لرز اٹھتا، دعا میں آپ ﷺ یوں گویا ہوتے کہ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مَسْئَلَۃَ الْمِسْکِیْنِ اے اللہ! جیسے مسکین مانگتا ہے ایسے ہی میں آپ سے سوال کرتا ہوں غزوۂ بدر میں تمام جنگی تدابیر اختیار کرنے کے بعد دورانِ دعا آپ ﷺ کے سوز وگداز کی کیفیت یہ تھی کہ ردائے مبارک آپ ﷺ کے کندھوں سے اتری جارہی تھی، وزیر خاص اور رفیق غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عرض کرنا پڑا کہ اے اللہ کے رسول! بس کیجئے! اللہ آپ کو ناامید ومایوس نہیں کرے گا، سفر طائف کے موقع پر باری تعالیٰ کے حضور آپ ﷺ کی مناجات احادیث کی کتابوں میں موجود اور محفوظ ہیں، یہ مناجات عبدیت و فنائیت کے اعلیٰ ترین شاہکار ہیں، پس تواضع وانکساری عاجزی وفروتنی، بے بسی اور بے چارگی کا اظہار دعا کے قبول ہونے کا پہلا مرحلہ ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اللہ سے کیا مانگنا چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ سے عافیت طلب کرو: سَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ (ریاض الصالحین کتاب الدعوات) عافیت دراصل ہر طرح کی بہتری اور بھلائی کو شامل ہے، انسان چاہے فقر وفاقہ میں ہو کہ مالداری یا معاشی خوشحالی میں، اطمینان اور سکونِ قلب اس کے لیے ضروری ہے، تب ہی وہ آرام وعافیت میں رہ سکتا ہے، آپ ﷺ کے دعائیہ کلمات جامع ہوا کرتے تھے، جس میں دنیا وآخرت کی ہر بھلائی وکامیابی شامل ہوتی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر یہ دعا فرماتے کہ: رَبَّنَا اٰتِنَا فِیْ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَ فِیْ الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ریاض الصالحین کتاب الدعوات) امّ المومنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ زیادہ تر کیا دعا فرمایا کرتے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ ﷺ اپنی دعا میں اکثر فرماتے کہ: ''یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ (حوالہ سابق) اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جما دے'' اس کے علاوہ بعض خاص مواقع اور حالات کے لیے دعائیں منقول ہیں، دعائیہ کلمات کے جامع ہونے کی مثال بعض اہل لطائف نے یہ لکھی ہے کہ ایک شخص کو درازیٔ عمر، اپنے فرزند کے لیے اولاد اور فقر وفاقہ وتنگدستی سے نجات کی دعا کرنا تھا، اس نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

’’اے اللہ! مجھے اتنی عمر عطا فرما کہ میں اپنے پوتروں کو سونے کے پیالوں میں چاندی کے چمچوں سے دودھ پیتے دیکھوں۔‘‘

دعا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے لیے آدمی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے، پُرامید ہونا چاہیے، ناامیدی اور مایوسی قریب بھٹکنے بھی نہ پائے، فرمان رسالت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی ہر دعا کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ وہ جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: جلد بازی کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دعا مانگے، پھر کچھ دنوں بعد کہنے لگے: میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا تھا وہ مانگا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ عطا ہی نہیں فرمایا، اس کے بعد اس نے دعا مانگنا ہی چھوڑ دیا (حوالۂ سابق) اصل میں دعا کی قبولیت کی یہ ایک ہی صورت نہیں کہ جس وقت جو چیز دعا میں مانگی جائے وہ اسی موقع پر مل جائے، اللہ تعالیٰ کی ذات چوں کہ علیم وخبیر ہے، وہ بندہ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے وہ اس کی رَگ رَگ سے واقف ہے، اس لیے جو چیز جس موقع پر اس کے لیے مناسب اور بہتر ہے وہی اس کو عطا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے وقت بندہ کی مثال اس چھوٹے سے بچے کی سی ہے جو اپنے نفع ونقصان کو جانے بوجھے بغیر اپنے والد سے ہر چیز طلب کرنا شروع کردے لیکن والدین اس کو وہی چیز دیتے ہیں جو اُس کے لئے مناسبِ حال ہوتی ہے، دعا کے قبول ہونے کی علماء نے تین صورتیں لکھی ہیں: ایک یہ کہ دعا میں جو چیز مانگی جائے اگر وہ باری تعالیٰ کے علم میں بندہ کے لیے مناسبِ حال ہو تو وہ چیز اسی وقت عطا کردی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس دعا کے بدلے بندہ پر آنے والی مصیبت وپریشانی کو ختم کردیا جاتا ہے، یہ بھی دعا کی قبولیت ہی کی ایک صورت ہے، تیسرے یہ کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو یہ دعا بندہ کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوتی ہے، آخرت میں اس دعا کا بدلہ اتنا زیادہ ہوگا کہ بندہ تمنا کرے گا کہ کاش میری تمام دعائیں محشر ہی میں قبول ہوتیں۔

● دعا صرف اپنی ذات کے لیے نہ مانگی جائے، بلکہ پوری انسانیت کو دعا میں یاد کیا جائے، ایک دیہاتی صحابی مسجدِ نبویؐ میں آئے اور یوں دعا کرنے لگے: ’’اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرمایئے‘‘ آپ ﷺ نے سن کر فرمایا کہ تم نے اللہ کی رحمت کو محدود کردیا، ضروری نہیں کہ جس کو ہم دعا میں یاد کریں وہ ہمارے ساتھ ہو یا سامنے موجود ہو، کسی کے پیٹھ پیچھے دعا کرنا بھی باعثِ فضیلت ہے۔ ● حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی دعا اپنے بھائی کے پیٹھ پیچھے قبول ہوتی ہے، جس وقت وہ دعا کرتا ہے تو اس کے سرہانے ایک فرشتہ متعین ہوتا ہے، پھر جب وہ اپنے بھائی کے واسطے خیر کو طلب کرتا ہے تو فرشتہ اس پر ’’آمین‘‘ کہتا ہے، پھر مزید کہتا ہے کہ: وَلَکَ بِمِثْلٍ تجھے بھی یہ خیر نصیب ہو۔ (حوالۂ سابق) ● دعا کی قبولیت کے لیے حلال روزی شرطِ اوّل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دعا کے وقت ’’یا ربی‘‘ ’’یا ربی‘‘ پکارتا

ہے، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا پہننا حرام، جو چیز حرام کمائی سے پلی ہے تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی؟

ملتِ اسلامیہ اس وقت جن نازک حالات سے گزر رہی ہے ہم میں کا تقریباً ہر فرد نہ صرف ان سے واقف ہے بلکہ اپنی دانست میں ان حالات کا بہترین ''تجزیہ نگار'' بھی ہے، شاید ہی کوئی تقریر وتحریر ہو جس میں حالات کا ماتم ومرثیہ نہ ہو، ایسے حالات میں اہل ایمان کو جہاں مادّی ہتھیاروں سے مسلح ہونا ہے وہیں ضروری ہے کہ ''دعا'' کے ہتھیار سے بھی وہ لیس ہوں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: اَلدُّعَاءُ سِلاَحُ الْمُؤْمِنِ دعا مؤمن کا ہتھیار ہے، دعا اور دوا دونوں اسوۂ نبی ﷺ ہے، صحابۂ کرام ؓ کی خوبی اور خصوصیت بھی یہی تھی کہ وہ دن کے شہسوار اور رات کے شب بیدار اور تہجد گزار ہوتے: فُرْسَانٌ فِيْ النَّهَارِ وَرُهْبَانٌ فِي اللَّيْلِ شہسواری کے تعلق سے صحیح یا غلط بہر حال فکر ہو رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ''شب بیداری'' کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، تب ہی مسلمان ''غیر کے آگے ہاتھ پھیلانے'' ''کشکول گدائی'' لے کر پھرنے اور دوسروں کی ''کاسہ لیسی'' کرنے سے محفوظ رہ سکتے ہیں، دعا کے آداب واحکام کو حضرت امجد حیدرآبادیؒ نے اپنی مشہور رباعی میں یوں جمع کیا ہے: ؎

ہر چیز مسببِ الاسباب سے مانگو
ادب سے، منت سے، سماجت سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلا تے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

(بقیہ صفحہ: ۴۹ سے)

جوان سب مشکلات کو برداشت کر کے خالص ایمان واسلام پر باقی رہے، یہ شخص ایسا ہے، جیسے ہاتھ پر انگارہ رکھے ہوئے ہو: ؎

ہم حوادث میں رہے کوہ و بیاباں کی طرح
اور ہوں گے ترے سانچے میں جو ڈھل جاتے ہیں

مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انھیں افراد کی وجہ سے دین کا تحفظ ہوتا ہے، فتنے رفع ہوتے ہیں، اور آخرت میں تو ان کا وہ عالم ہوگا کہ سو سو شہیدوں کا ثواب حاصل کریں گے، اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا انھیں حاصل ہوگی۔

گوشۂ رمضان

اعتکاف۔ فضائل ومسائل

حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی مظاہری*

اعتکاف کی مشروعیت اوراس کا حکم

اعتکاف کی مشروعیت کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، کتاب یعنی قرآن مجید سے اس کا ثبوت اس آیت سے ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ ''اور تم جب مسجدوں میں اعتکاف کی حالت میں ہوتو اپنی بیویوں سے مباشرت مت کرو''۔اورسنت سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے پردہ فرما گئے، پھر آپ کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات نے اعتکاف کیا۔(بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہؓ ،حضرت عبداللہ بن عمرؓ ،حضرت ابی بن کعبؓ وغیرہ حضراتِ صحابہ سے بھی اس طرح کی روایات احادیث میں موجود ہیں ، اور اعتکاف سابقہ امتوں میں بھی مشروع تھا، جیسا کہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے: وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ''اور ہم نے حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔(البقرۃ) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضور ا سے دریافت فرمایا کہ میں نے جاہلیت کے زمانہ میں (یعنی قبل اسلام) نذر مانی تھا کہ مسجدِ حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا (اب میرے لیے کیا حکم ہے ؟) آپ نے فرمایا کہ تم اپنی نذر پوری کرو۔(بخاری)

اعتکاف اور معتکف کی فضیلت

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ معتکف ہر ہر لمحہ گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور یہ کہ وہ خاموش رہے یا سوتا رہے تب بھی اس کے لیے نیکیاں اسی طرح لکھی جاتی ہیں جس طرح

* ناظم مدرسہ سبیل الفلاح ، بنڈلہ گوڑا، حیدرآباد

نیکیوں اور عبادت میں مشغول شخص کے لیے لکھی جاتی ہیں۔(ابن ماجہ)

صاحبِ مراقی الفلاح لکھتے ہیں کہ اعتکاف اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو افضل ترین اعمال میں سے ہے، اس کی خصوصیت حدِ احصاء سے خارج ہیں۔

(۱) معتکف کے تمام اوقات نماز میں صرف ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ یا تو حقیقتاً نماز میں ہوتا ہے یا پھر حکماً نماز میں ہوتا ہے۔یعنی نماز کے انتظار میں ہوتا ہے، کیونکہ اعتکاف کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے، گویا کہ معتکف ہر وقت نماز کے انتظار میں رہتا ہے، چنانچہ حدیثِ شریف میں ہے کہ اَلْمُنْتَظِرُ فِی الصَّلٰوۃِ کَاَنَّہٗ فِی الصَّلٰوۃِ ''نماز کا انتظار کرنے والا بھی نمازی کے حکم میں ہے''۔

(۲) معتکف گویا کہ فرشتوں کے مشابہ ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ''اللہ نے ان کو جن کاموں کا حکم دیا ہے اس میں وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کام کرتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

(۳) معتکف روزہ کی حالت میں ہوتا ہے اور روزہ دار اللہ کا مہمان ہوتا ہے، گویا کہ معتکف بھی اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے۔

(۴) معتکف مضبوط قلعہ میں محفوظ ہوتا ہے، ہر قسم کے گناہوں سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔

(۵) معتکف بہ یک وقت دس قسم کی عبادتوں کا ثواب حاصل کرسکتا ہے، مثلاً روزہ، تلاوتِ قرآن، توبہ واستغفار، ذکر واذکار، انتظارِ صلوٰۃ، اعتکاف، عشرۂ اخیرہ کی عبادت، شبِ قدر کی عبادات اور معاصی سے اجتناب

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا اہتمام

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تادمِ حیات رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات نے اعتکاف کا اہتمام باقی رکھا۔(بخاری) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے تھے۔اور جس سال آپ کا وصال ہوا ہے اس سال رمضان شریف میں آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا تھا۔(بخاری) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم ارمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔(مسلم) حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضور ارمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے، کسی سال آپ اعتکاف نہیں فرما سکے تو اگلے سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔(ترمذی) حضرت نافعؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے

اور ان کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مسجدِ نبوی میں وہ جگہ دکھلائی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف کے لیے مسجدِ نبوی میں اسطوانۂ توبہ کے قریب حضورا کے لیے بستر لگایا جاتا تھا۔ (ابن ماجہ)

عشرۂ اخیر کے اعتکاف کا حکم

رمضان کے عشرۂ آخر کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگرچہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ طیبہ میں اعتکاف کا اہتمام فرمایا، مگر بعض صحابہ کے اعتکاف نہ کرنے پر انکار بھی نہیں فرمایا، اس لیے یہ سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہوا جیسا کہ درِمختار میں وضاحت ہے: وسنة مؤكدة في العشرة الأخيرين من رمضان اى سنة كفاية كما في البرهان وغيره لاقترانها بعدم الانكار على ممن لم يفعله من الصحابة۔

(درِمختار ۳/۴۳۰)

عمدۃ الفقہ میں لکھا ہے کہ ہر سال رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ ہے اور یہ سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگر کچھ لوگوں نے اس سنت کو ادا کرلیا تو باقی لوگوں کی طرف سے یہ سنت ساقط ہوجائے گی اور اگر بستی میں سے کوئی بھی اس سنتِ مؤکدہ کو ادا نہیں کریں گے تو سب کے سب گنہگار رہوں گے۔ (عمدۃ الفقہ)

معتکف کے لیے اعمال

(۱) قرآن پاک کی تلاوت کرے (۲) حدیث شریف کا مطالعہ کرے (۳) دین کا علم حاصل کرے (۴) نبی کریم ا کی سیرتِ پاک کا مطالعہ کرے (۵) پیغمبروں کے قصے پڑھا کرے (۶) اولیاءِ کرام اور صالحین کی حکایات اور ان کے مواعظ وملفوظات پڑھے یا سنے (۷) دین کی ضروری باتوں کو لکھتے رہا کرے (۸) حضورا پر درود شریف کی کثرت کرے (۹) اللہ کے ذکر کی کثرت کرے (۱۰) توبہ واستغفار میں مصروف رہے (۱۱) اپنے نفس کا محاسبہ کرے (۱۲) موت کا مراقبہ کرے (۱۳) مرنے کے بعد کی زندگی کو سوچا کرے (۱۴) بعث، حشر ونشر اور حساب وغیرہ کا تصور کرے (۱۵) دن بھر میں کم از کم ایک مرتبہ تحیۃ المسجد ادا کرلیا کرے (۱۶) جب وضو کرکے مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ الوضو پڑھ لیا کرے (۱۷) تہجد، اشراق، چاشت، اوّابین اور فرض سے پہلے اور بعد کی سنتوں اور نفلوں کا اہتمام کرے (۱۸) لایعنی، فضول، لغو کلام اور کام سے پرہیز کرے۔

معتکف کے لیے چند ہدایات

(۱) بہتر یہ ہے کہ محلہ کی تمام مساجد میں کم از کم ایک آدمی اعتکاف ضرور کرے۔

(۲) ہر بستی اور آبادی میں کم از کم ایک آدمی کا معتکف ہونا ضروری ہے، سنتِ مؤکدہ علیٰ الکفایہ ہے، پوری بستی اور آبادی میں کوئی بھی اعتکاف نہ کرے تو سب ہی مسلمانوں کو ترکِ سنتِ مؤکدہ علیٰ الکفایہ کا گناہ ہوگا۔ (۳) اعتکاف انہی مساجد میں ہونا چاہیے جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہو، کسی جماعت خانہ یا نماز گاہ یا مدرسہ وخانقاہ میں اعتکاف کرنے سے اعتکاف کی سنت ادا نہ ہوگی۔

(۴) اعتکاف میں بیٹھنے والے مرد حضرات کے لیے ضروری ہے کہ ۲۰؍رمضان کو غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں داخل ہو جائیں۔

(۵) عورت اپنے گھر میں اعتکاف کرے، اس طرح کہ گھر میں پہلے سے پنج وقتہ نماز کے لیے جو جگہ مقرر ہے اس جگہ میں ۲۰؍رمضان کو سورج غروب ہونے سے پہلے اعتکاف کی نیت کر کے بیٹھ جائے اور اگر گھر میں پہلے سے کوئی ایسی جگہ مقرر نہ ہو تو اب مقرر کر کے پھر اس میں اعتکاف کرے۔

(۶) معتکف حضرات کو مسجد میں اپنا سامان بستر وغیرہ سلیقہ سے رکھنا چاہیے، تاکہ اوقاتِ نماز میں دوسروں کی نماز یا صف بندی میں حرج اور خلل نہ ہو۔ جگہ ضرورت سے زیادہ گھیر کر نہ رکھیں۔

(۷) اعتکاف میں نابالغ اور کم سن ناسمجھ بچوں کو ساتھ میں نہ رکھیں، اور نہ ہی ان کو اعتکاف کرائیں، البتہ سمجھدار نابالغ بچہ اعتکاف بھی کر سکتا ہے اور ساتھ میں بھی رہ سکتا ہے۔

(۸) ایک محلہ کی مسجد والوں نے دوسرے محلہ سے کسی کو بلا کر یا دوسرے محلہ کے آدمی نے از خود کسی دوسرے محلہ کی مسجد میں اعتکاف کر لیا تو ان کے اعتکاف کی وجہ سے اس محلہ والوں کے ذمہ سے سنت ساقط نہیں ہوگی۔

(۹) کسی کو پیسوں کا لالچ دے کر یا معاوضہ مقرر کر کے اعتکاف میں بٹھایا ہو تو ایسا اعتکاف معتبر نہیں ہوگا، اس سے سنتِ مؤکدہ علیٰ الکفایہ ادا نہ ہوگی۔ اعتکاف عبادت ہے، اس کو تجارت یا مال کمانے کا ذریعہ بنالینا جائز نہیں۔

وہ اعمال جو معتکف کے لیے مباح اور جائز ہیں

(۱) حالتِ اعتکاف میں مسجد کے قریب بیوی بچے آجائیں تو ان سے جائز ضروری بات کی جاسکتی ہے، دوست واحباب مسجد میں آجائیں تو ان سے ملاقات اور احوال دریافت کیے جاسکتے ہیں۔

(۲) کاروبار وغیرہ کی صرف معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ بہت ہی ناگزیر اور ضروری ہو تو سامان کو مسجد میں لائے بغیر تجارتی معاملات بھی کیے جاسکتے ہیں۔

(۳) ایسی مسجد میں اعتکاف کیا ہو جہاں جمعہ واجب ہو اور جمعہ کی نماز اس مسجد میں نہ ہوتی ہو تو پھر جمعہ کی ادائیگی کے لیے قریب کی مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔

(۴) معتکفین کے لیے مسجد کے مقررہ معمول کے مطابق مسجد کی بجلی (کرنٹ) سے استفادہ جائز ہے، معمول سے زائد استعمال ہونے پر زائد بجلی کا صرفہ مسجد میں جمع کر دینا ہوگا۔

(۵) عذر کی وجہ سے پلنگ یا تخت پر سونا چاہے تو معتکف کو اجازت ہے، اسی طرح کرسی استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو وہ بھی جائز ہے، مگر دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔

(۶) معتکف حدودِ مسجد میں چل پھر سکتا ہے، ٹہل سکتا ہے، ایک ہی جگہ بیٹھے رہنا ضروری نہیں ہے۔

(۷) مؤذن معتکف اور غیر مؤذن معتکف کے لیے بھی اذان دینے کے لیے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔

(۸) معتکف مسجد میں اپنے ناخن تراش سکتا ہے، سر کے بال اور مونچھوں کے بال کی اصلاح کر سکتا ہے، خود بھی کر سکتا ہے اور دوسروں سے بھی کرا سکتا ہے، البتہ نائی اور حجام سے اجرت دے کر کرانے کی صورت میں تفصیل یہ ہے کہ معتکف حدودِ مسجد میں ہو اور نائی (حجام) خارج مسجد ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اگر دونوں مسجد سے باہر ہوں تو معتکف کا اعتکاف فاسد اور اگر دونوں مسجد کے اندر ہوں تو جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں مسجد میں کسب اور کمانا لازم آئے گا اور مسجد میں کسب جائز نہیں، تاہم اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔

وہ اعمال جن سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے یا مکروہ ہو جاتا ہے

(۱) معتکف اگر بھولے سے بھی مسجد سے خارج ہو جائے تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(۲) وضو کے لیے وضو خانہ میں جا کر وضو کرنے کے بجائے وہاں ٹھہر کر کسی سے بات کرنے لگے یا کسی اور کام میں لگ جائے تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا، مگر ایسی بے تعلقی جو اعتکاف کے مقصد کے خلاف ہو، یعنی خالق کی طرف سے ہٹ کر مخلوق کی طرف مشغول ہو جائیں، مناسب نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح وضو سے فارغ ہو کر فوراً حدودِ مسجد میں داخل ہونے کے بجائے وضو خانہ میں کھڑے ہو کر تولیہ وغیرہ سے منہ پوچھنے لگے یا بات کرتے ہوئے ٹھہر جائے تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(۴) مسجد کے سامان کا کمرہ یا اذان کا کمرہ جو عموماً خارجِ مسجد ہوتا ہے اس میں داخل ہونے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(۵) ایسے گاؤں کی مسجد میں اعتکاف کیا ہو جہاں جمعہ واجب ہی نہیں ہے تو پھر جمعہ کے لیے مسجد سے باہر نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(۶) معتکف کے لیے کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے یا صرف مسواک کرنے اور منجن کرنے کے لیے یا یونہی منہ ہاتھ صابن سے دھونے کے لیے وضوخانہ میں جانے کی اجازت نہیں ہے، اگر ان کاموں کے لیے وضوخانہ میں چلا جائے یا اصل مسجد سے باہر نکل جائے تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا، ان ضرورتوں کے لیے کوئی ٹب رکھ کر مسجد ہی میں دھولینا چاہیے، اس طرح کہ مسجد یا مسجد کا فرش ملوث نہ ہو۔ اسی طرح وضو ہونے کے باوجود تازہ وضو بنانے کے لیے معتکف کو مسجد سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

(۷) مسجد کا وہ سامان جو عام نمازیوں کے استفادہ کے لیے ہو اس پر ایسا قبضہ کہ دوسرے مستفید نہ ہوسکیں جائز نہیں ہے۔

(۸) مریض کی عیادت، کسی کے انتقال پر تعزیت، جنازہ میں شرکت اور نمازِ جنازہ کی امامت، اور نمازِ جنازہ وغیرہ میں شرکت کے لیے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۹) بیوی سے پیار و محبت اور مباشرت وغیرہ کی باتیں کرنا اعتکاف کی حالت میں مکروہ ہے۔

(۱۰) حالتِ اعتکاف میں ایسے اخبار، رسائل وغیرہ کا مطالعہ نہ کرے جس میں عریاں اور ننگی تصاویر ہوتی ہوں، ایسی چیزوں کا مسجد میں لانا سخت منع ہے۔

(۱۱) ۲۹؍رمضان المبارک کو چاند ہونے کا اطمینان کیے بغیر مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، جب چاند کا پوری طرح اطمینان ہوجائے اور چاند کا ہونا معلوم ہوجائے تب ہی مسجد سے نکلے۔

(۱۲) اعتکاف کی حالت میں حدودِ مسجد سے بلاضرورت باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ پیشاب پاخانہ کی حاجت ہو، یا غسلِ جنابت لاحق ہوا ہو، یا جمعہ کی ادائیگی کے لیے دوسری مسجد میں جانے کی ضرورت ہو، بشرطیکہ اس گاؤں یا بستی میں جمعہ واجب ہو۔

(۱۳) عورت کا اعتکاف حیض کی وجہ سے ٹوٹ جائے گا۔ پاک ہونے کے بعد اگر رمضان ہی میں موقعہ ملے ورنہ رمضان شریف کے بعد صرف اُس ایک دن کے اعتکاف کی قضا کرے جس دن حیض شروع ہوا تھا۔ اس قضا کی صورت میں ایک دن کا روزہ بھی لازم ہوگا۔

(۱۴) مسجد دو منزلہ ہو اور اس کی سیڑھیاں مسجد کے اندر سے ہوں تو معتکف مسجد کی دوسری منزل یا مسجد کی چھت پر جاسکتا ہے۔ اور اگر سیڑھیاں مسجد کے باہر سے ہوں تو دوسری منزل یا چھت پر جانے سے اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔

اصلاحی مضامین

اذان زندہ حقائق کا اعلان ہے!

از: محمد ندیم الدین قاسمی*

اذان دیگر شعائر واُحکامِ اسلام کی طرح ایک قابلِ احترام شعار ہے، یہ محض نماز کے وقت کا اعلان ہی نہیں؛ بلکہ ایسے حقائق کا مجموعہ اور سرچشمہ ہے، جن تک ہماری نظر وفکر کی رسائی نہیں؛ چنانچہ علماء امت نے اذان کے بہت سے حقائق بیان کیے ہیں:

پہلی حقیقت: اللہ کی عظمت و بڑائی

انسان ظاہر پرست، مادی چیزوں کی عظمت سے جلد متأثر ہوجاتا ہے، آسمانوں کی عظمت، زمین کی وسعت وطوالت، پہاڑوں کی ہیبت، سورج و چاند کی چمک دمک، مال و دولت کی ریل پیل سے مرعوب ہوکر یہ یقین کر بیٹھتا ہے کہ یہی مشکل کشا ہیں یا ان کے اندر خدائی روح حلول کرگئی ہے، نیز کبھی کبھی تو دولت کے نشہ میں خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے؛ اسی لئے سب سے زیادہ ضرب اسی بڑائی کے عقیدے اور تصور پر لگائی گئی، اور زبان سے بار بار" اللہ اکبر، اللہ اکبر" کہلایا گیا کہ مادی چیزوں کو بڑا سمجھنے والو! عظمت و کبریائی کے مستحق صرف اللہ ہے اس کے مقابلے میں سب بزرگیاں ہیچ ہیں، اس لئے آؤ! اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاؤ۔

دوسری حقیقت: لا الہ الا اللہ کی شہادت

یہ وہ شہادت ہے جسے آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخالفتوں کے ہجوم میں، پتھروں کی بارش میں، گالیوں کی بوچھاڑ میں، ڈنکے کی چوٹ پر بیان کیا۔ جس کے ایک معنی "لا معبود الا اللہ" (عبادت صرف اللہ کی ہے) عبادت میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں ا۔محبت ۲۔اطاعت۔ اگر محبت ہو مگر اطاعت نہ ہو تو بھی عبادت نہیں، اگر اطاعت ہے مگر محبت نہیں تو بھی عبادت نہیں، محبت کا تقاضہ تو یہ ہے ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گویا دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اس قدر سما جائے کہ غیر کی محبت کے لئے جگہ ہی باقی نہ رہے، اور ظاہر سی بات ہے جب خدا سے محبت ہو جائے گی تو خدا سے قریب کرنے والی چیزوں سے بھی محبت ہوگی، لہو ولعب کی محفلوں سے نفرت اور اس کے ذکر سے محبت پیدا ہو جائے گی جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: من أحب شیئا اکثر ذکرہ (جس سے انسان محبت کرتا ہے اس کا کثرت سے ذکر بھی کرتا ہے) اور محبت کا تقاضہ ہے کہ اس کے سامنے ہم سجدہ ریز ہو جائیں اور اس کی دعوت پر "لبیک" کہیں۔

تیسری حقیقت: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت

جب مؤذن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتا ہے تو وہ حقیقت میں تمام مسلمانوں کی جانب سے تین باتوں کا اعلان کرتا ہے:

۱۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت اور آپ کی تعظیم کرتے ہیں؛ کیوں کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ ہو تو شہادت تو کیا ایمان بھی ناقص ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ: لا یؤمن احدکم حتی أکون أحب الیه من نفسه (رواہ البخاری) تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔

۲۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام اور کام کی اشاعت بھی کریں گے اور حفاظت بھی۔

۳۔ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع واطاعت بھی کریں گے کیوں کہ

محمدؐ کی غلامی دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

چوتھی حقیقت: نماز فلاح وکامیابی کا راستہ ہے:

مؤذن "حیّ علی الصلاۃ" کے بعد "حیّ علی الفلاح" کہہ کر بتاتا ہے کہ لوگو! کامیابی مال ودولت اور اللہ کی نافرمانی میں نہیں؛ بلکہ اللہ کی بندگی میں ہے، اور بندگی کی کامل ترین صورت "نماز" ہے۔

۵۔ دوبارہ اللہ کی عظمت وکبریائی کا اعلان:

آخر میں مؤذن دوبارہ "لا الٰہ الا اللہ" کہہ کر بتلاتا ہے کہ لوگو! پھر سن لو! عبادت کے لائق وہی اللہ ہے جو قوتوں اور عناصر کا مالک ہے، امیدوں کا مرجع وہی ہے، اس سے مفر کہیں بھی نہیں۔

اگر ہم ان حقائق کو سامنے رکھ کر اذان سنیں گے تو کچھ اور ہی روحانی لطف محسوس ہوگا، اللہ ہمیں زندگی کے ہر قدم پر ان حقائق کو سامنے رکھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

اصلاحی مضامین

نمازِ تراویح پر شکوک و شبہات کیوں؟

مولانا زاہد الراشدی مدظلہ *

مساجد میں رمضان المبارک کے دوران عشاء کی نماز کے بعد باجماعت نماز تراویح کا آغاز امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا جو آج تک دنیا بھر میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس سے قبل تراویح فرداً فرداً پڑھی جاتی تھیں، حضرات صحابہ کرامؓ اپنے اپنے ذوق کے مطابق اکیلے اکیلے یا مختلف ٹولیوں کی صورت میں یہ نماز پڑھتے تھے۔ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے اجتہادی فیصلوں میں سے ہے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے طے کیا کہ مسجد نبویؐ میں نماز تراویح باجماعت پڑھی جائے گی اور سب لوگ اکٹھے ایک ہی امام کے پیچھے پڑھیں گے۔ حضرت ابی بن کعبؓ اس دور میں سب سے بڑے قاری تھے جنہیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِقرأ کا خطاب دیا تھا کہ یہ میرے ساتھیوں میں سب سے اچھا قاری ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہی کو حکم دیا کہ وہ بیس رکعات تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائیں اور رمضان المبارک کے دوران کم از کم ایک بار قرآن کریم ضرور سنا دیں۔ یہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کا حکم تھا جس پر سب صحابہ کرامؓ نے اتفاق کر لیا اور ان کے اجماع و اتفاق سے اسے سنت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

چنانچہ تب سے یہ کارِ خیر جاری ہے اور دنیا کے ہر حصے میں مسلمان اس سنت کی ادائیگی کا ہر سال اہتمام کرتے ہیں جس سے لاکھوں حفاظ قرآن کو کلام پاک سنانے اور کروڑوں مسلمانوں کو حالت نماز میں قرآن کریم سننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ سمیت دنیا بھر میں تراویح مجموعی طور پر بیس رکعت کی تعداد میں ہی پڑھی جاتی ہیں، البتہ بعض حلقوں میں بیس کی بجائے آٹھ رکعتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مگر تراویح باجماعت پڑھنے، پورے رمضان میں روزانہ ادا کرنے، اور اس میں قرآن کریم سنانے کا اہتمام ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تعداد کے اختلاف کے سوا نماز تراویح کی دیگر کیفیات میں وہ بھی جمہور امت کے ساتھ متفق ہیں اور یوں تراویح کی ادائیگی اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام حلقوں میں متفقہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

* صدر مدرس و ناظم تعلیمات جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

آٹھ اور بیس رکعت تراویح کے اختلاف پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ چند سال قبل سپرنگ فیلڈ، ورجینیا (امریکہ) کے دینی مرکز دارالہدیٰ میں نماز تراویح کے آغاز پر میں بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے اچانک سوال کر دیا کہ ’’کیا آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی تراویح ہو جاتی ہیں؟‘‘ اس قسم کے سوالات عمومی مجمع میں عام طور پر مسلکی چھیڑ چھاڑ کے لیے کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان صاحب کو ایک سادہ سا جواب دیا کہ ’’ہاں آٹھ رکعت تراویح ہو جاتی ہیں لیکن بارہ رکعت رہ جاتی ہے‘‘۔ اس پر وہ صاحب تو خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے البتہ ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالحمید اصغر، جو اس وقت اس مرکز کے امام تھے، بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اس جواب کا بعد میں متعدد بار ذکر کیا اور کہا کہ عجیب جواب دیا ہے کہ آٹھ رکعت ہو جاتی ہے لیکن بارہ رہ جاتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں سوال کرنے والے کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے جو معاملہ تھا وہ میں نے بتا دیا۔

ہمارے ہاں بھی بعض دانش وروں نے یہ سوال کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت محمدؐ کے زمانے میں اس طرح تراویح نہیں ہوتی تھیں اس لیے یہ بعد میں مولویوں کی ایجاد لگتی ہے۔ یہ عجیب سی روایت بن گئی ہے کہ دین کی جس بات سے انکار کرنا مقصود ہو اسے مولویوں کی ایجاد کہہ کر پہلے تو اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، سنت نبویؐ پر ہے، یا تعامل صحابہؓ پر ہے۔ بس مولوی کا لفظ اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کے کھاتے میں ڈال کر دین کی کسی بھی بات سے انکار کر دیا جائے۔

گزشتہ روز ایک نوجوان نے مجھ سے یہی سوال کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں تراویح اس طرح ادا نہیں کی گئیں تو بعد میں مولویوں نے یہ کیوں شروع کر دی تھیں؟ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا پہلے یہ معلوم کر لو کہ یہ تراویح شروع کس مولوی نے کی تھیں؟ کہنے لگا کہ یہ مجھے معلوم نہیں ہے، میں نے کہا کہ معلوم تو کر لینا چاہیے۔ اس نے کہا کہ آپ ہی بتا دیں۔ میں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے سب سے پہلے تراویح پڑھائی تھیں، اور ان کے پیچھے پڑھنے والے کم و بیش سبھی صحابہ کرامؓ تھے۔ اس لیے اگر ان مولویوں پر اعتماد ہے تو تم بھی پڑھ لیا کرو لیکن اگر خدانخواستہ ان پر اعتماد نہیں ہے تو پھر صرف تراویح کا معاملہ نہیں، پورے دین سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی کہ سارا دین انہی کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور شاید بعض دانشور حضرات اپنے طرز فکر سے اسی قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاحی مضامین

فتنوں کی ہمہ گیری اور اس سے بچنے کی تدبیر

از: مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

مشہور محدث امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج قشیری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح میں جو مسلم شریف کے نام سے معروف ہے، اور صحاح ستہ (حدیث کی چھ صحیح کتابوں) میں ایک ہے، اور بخاری شریف کے بعد اسی کا درجہ کا ہے، ایک مفصل حدیث نقل کی ہے، جو ہمارے موجودہ حالات میں بہت ہی قابل غور ہے، اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا، اور انھیں عمل میں لانے کا اہتمام کرنا بہت ہی ضروری ہے، اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ بہت ہی خاص خاص باتیں بتایا کرتے تھے، اور اسی لیے وہ آپ کے ''صاحب سر'' (رازوں سے باخبر) کہے جاتے تھے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے قول وعمل کا بہت لحاظ رکھتے تھے، یہی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے فتنوں کا تذکرہ سنا ہے، کچھ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ شاید تم وہ فتنہ سمجھ رہے ہو، جو آدمی کو اس کے اہل وعیال اور پڑوس کے سلسلے میں پیش آتا ہے، انھوں نے کہا جی! ہم یہی سمجھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ تو نماز، روزہ اور صدقہ سے ہو جاتا ہے، لیکن کسی نے آپ سے اس فتنہ کا تذکرہ سنا ہے؟ جو سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا چلے گا۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے، میں نے عرض کیا کہ میں نے سنا ہے، فرمایا: ہاں تم نے سنا ہوگا، اللہ تمھارے باپ کو مبارک کرے! حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ فتنے قلوب پر لگاتار اس طرح آئیں گے جیسے چٹائی ایک ایک تنکے سے بنی جاتی ہے، تو جس قلب میں یہ فتنے جذب ہو گئے، اس میں سیاہ نقطے پڑ جاتے ہیں، اور جس قلب نے انھیں اجنبی سمجھ کر جھٹک دیا، اس میں ایک روشن نقطہ بن جاتا ہے، اس طرح ایک قلب تو بالکل سنگ مرمر کی طرح سفید اور روشن ہو جاتا ہے، جس میں رہتی دنیا تک کوئی فتنہ اثر نہیں کر سکتا، اور دوسرا قلب کالا، راکھ میں اٹا ہوا الٹے پیالے کی طرح ہو جاتا ہے، جو نہ معروف سے مانوس ہوتا، اور نہ منکر سے اسے وحشت ہوتی، وہ صرف اسی چیز کو جانتا ہے، جسے اس کی نفسانیت نے جذب کیا ہے''۔

حدیث میں بعض اجزاء اور بھی ہیں، لیکن ہم نے اپنے موضوع سے متعلق جو حصہ تھا، اسے نقل کیا ہے، یہاں حدیث کے چند الفاظ کی وضاحت ضروری ہے، تاکہ قارئین کے سامنے وہ بات واضح رہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے۔

اس میں ایک لفظ ''فتنہ'' ہے، اس کی جمع ''فتن'' ہے، اردو محاورہ میں فتنہ کا معنی لڑائی جھگڑا اور اختلاف و انتشار ہے، لیکن عربی میں ''فتنہ'' کا معنیٰ امتحان اور آزمائش کے ہیں، خواہ وہ امتحان اپنے نتیجہ کے اعتبار سے خیر ہو، یا شر، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال اس آزمائش اور امتحان کے لیے ہوتا ہے، جس سے شر کا ظہور ہوتا ہو، چنانچہ فتنہ کا اطلاق کفر پر، دور از کار تاویلات پر، ذلت و رسوائی پر، مصیبت اور عذاب پر، لڑائی جھگڑے پر، اچھائی سے برائی کی طرف پلٹنے پر اور کسی چیز کی محبت میں غلو پر ہوتا ہے۔

اہل و مال کا فتنہ یہ ہے کہ ان کی محبت میں پڑ کر آدمی دینی احکام میں کوتاہی کرنے لگتا ہے، یہی حال پڑوس کا بھی ہوتا ہے، کبھی پڑوس کی محبت میں اور کبھی اس کی عداوت میں آدمی حد سے تجاوز کر جاتا ہے، اور غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ان غلطیوں کا کفارہ روزمرہ کی عبادات ہو جاتی ہیں، یہ فتنے تو ہمہ دم آدمی کے ساتھ ہیں، ان کی اصلاح و مغفرت کا سامان بھی منجانب اللہ مہیا ہیں، اگر آدمی نماز روزے اور عبادات کا پابند ہے، تو یہ روزمرہ کی خطائیں، خود بخود دُھلتی رہتی ہیں۔

لیکن ایک فتنہ وہ ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ تموجُ موجَ البحرِ ،سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا آئے گا، یعنی جس طرح سمندر کی موجیں باہم ٹکراتی ہیں، ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح سر اٹھاتی ہیں، جیسے ہر ایک دوسرے کے تعاقب میں ہے، اسی طرح یہ فتنے یکے بعد دیگرے آئیں گے، باہم گتھم گتھا ہوں گے، لڑائی جھگڑے کی کثرت ہوگی، کوئی کسی کی رعایت کو تیار نہ ہوگا، پاس و لحاظ اٹھ جائے گا، لوگ جانوروں سے بدتر ہو جائیں گے، ان فتنوں کی کیفیت کیا ہوگی، فرماتے ہیں کہ تُعرَضُ الفِتَنُ علَی القُلوبِ کالحَصِیرِ عُوداً عُوداً جس طرح چٹائی بنی جاتی ہے، تو ایک تنکے کو دوسرے تنکے سے جوڑتے چلے جاتے ہیں، اسی طرح قلوب فتنوں کی آماجگاہ بن جائیں گے، ایک فتنہ آئے گا اور معاً اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا، اگر قلب ہر فتنہ سے متاثر ہوتا گیا، اور اس میں ملوث ہوتا رہا تو وہ سیاہ ہوتا رہے گا، اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ بالکل کالا ہو کر رہ جائے گا، جیسے راکھ میں اٹا ہوا اور اوندھے پیالے کی طرح ہو جائے گا کہ اس میں نہ علم ٹھہرے گا، نہ معرفت۔ خیر کی ہر بات اس سے باہر ٹپک جائے گی، پھر نہ اسے نیکی اور خیر کی کوئی پہچان ہوگی، نہ اس سے مانوس ہوگا، اور نہ برائی سے اسے کوئی وحشت اور تنفر باقی رہے گا، یعنی بھلائی سے دور اور برائی میں ڈوبا ہوا ہوگا، وہ بس اسی بات کو قبول

کرے گا، جو اس کی خواہش نفس کے مطابق ہو۔

اور اگر قلب ایسا ہے کہ اس نے ان فتنوں کو رد کر دیا، ان سے نہ متاثر ہوا، اور نہ ان میں ملوث ہوا، بلکہ علم و معرفت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اطاعت الٰہی میں سرگرم رہا، تو وہ قلب ایسا ہوگا، جیسے سنگ مرمر جو چکنا بھی ہوتا ہے، اور سفید بھی کہ اس پر کوئی گندگی اثر نہیں کرتی، اسی طرح یہ دل صاف اور روشن ہوتا ہے، اور پتھر کی طرح مضبوط ہوتا ہے، اس پر کوئی فتنہ اثر نہیں کر سکے گا۔

اس حدیث پر غور کریں، اور جن حالات سے مسلمان گزر رہے ہیں، ان پر غور کریں، تو یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں معلوم ہوتی ہے۔ آج ہمارے سامنے واقعی وہی منظر ہے کہ فتنہ موجیں مار رہا ہے، اس پوری کائنات انسانی میں ہر طرف جو چیز بکھری ہوئی پڑی ہے، بلکہ سب پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے، وہ فتنہ ہی ہے، گھر گھر بلکہ ہر ہر فرد کو یہ فتنہ عام ہے، ایک فتنہ تھمتا نہیں کہ دوسرا فتنہ سامنے آجاتا ہے، یہ فتنے باہر سے اٹھتے ہیں اور دلوں کے اندر جذب ہوتے ہیں، اور دل کے اندر سے اٹھتے ہیں اور باہر پھیلتے جاتے ہیں۔

فتنوں کے عموم وشیوع کا یہ حال ہے کہ ایک بات کہیں سے اٹھتی ہے، اور ذرائع ابلاغ کی قوت ووسعت اس کو چند لمحوں میں ساری دنیا میں پہنچا دیتی ہے، اور جگہ جگہ فتنے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، مثلاً:

ڈیڑھ دو سال پہلے امریکہ کی ایک بلند وبالا عمارت پر حملہ ہوا، کس نے حملہ کیا، اس بات کی آج تک تحقیق نہ ہو سکی، ادھر یہ حملہ ہو رہا ہے، عمارت تباہ ہو رہی ہے، اور ساری دنیا کو یہ بات معلوم ہوگئی، سب تھرا گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ سب کی ٹکٹکی ادھر ہی لگ گئی، اور نزلہ گرا ایک غریب، اور بے کس ملک پر، کیونکہ وہ مسلمان تھا، اور مسلمان رہنا چاہتا تھا، مہینوں ساری دنیا کی نگاہیں اسی پر لگی رہیں، قلوب الٹتے پلٹتے رہے، لوگ شور مچاتے رہے کہ غلط ہو رہا ہے، مگر سمندر بن کر جو فتنہ موج مار رہا ہو، وہاں کوئی آواز کب سنائی دے سکتی ہے؟ اس فتنہ کا اثر ساری دنیا پر پڑا، کتنے لوگوں کے ایمان ڈگمگائے، خدا ورسول پر جنکو یقین تھا، وہ شک میں مبتلا ہونے لگے، مایوسی و شکستگی کی بدلیاں فضائے قلوب پر چھا گئیں، لوگ ایسا محسوس کرنے لگے کہ افغانستان اور طالبان نہیں، خود اسلام ختم ہو جائے گا، یہ فتنہ تھمتا تو کیا؟ فتنہ پرور ہی ذرا تھک گیا، تو دوسرے چند ممالک کو دھمکیاں دے کر ہراساں کرنے لگا، اور اپنے سدھائے ہوئے کتے اسرائیل کی پیٹھ ٹھونک دی، اس نے فلسطینیوں پر ہلہ بول دیا، اور ظلم ودرندگی کی وہ خونچکاں داستان مرتب کی کہ اگلے پچھلے سب ظالم شرما جائیں۔

اُدھر یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ہندوستان میں بابری مسجد کو عنوان بنا کر گودھرا میں فتنہ کی ایک چنگاری پھینکی گئی، اور وہ آن واحد میں شعلہ بن کر احمد آباد اور اس کے مضافات میں مسلم آبادیوں کو تہس نہس کر گئی۔ اللہ جانے

اس کی چنگاریاں کہاں کہاں اڑ کر پہنچی ہیں، ان مسلسل فتنوں کی وجہ سے قلوب کی حالت بگڑ گئی ہے، ظلم وستم کی ہر چیرہ دستی کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ اب قلوب اللہ کی طرف پلٹیں گے، اب لوگ اللہ کو راضی کرنے کی تگ ودو کریں گے، مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ معاملہ برعکس ہو رہا ہے، قلوب میں اللہ سے بغاوت کا جذبہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے، برائیوں کی طرف جھکاؤ زیادہ ہو جاتا ہے، اصلاحِ حال کے بجائے خرابی کی صورت پھیل جاتی ہے، ایک فتنہ باہر موج مار رہا ہے اور ایک فتنہ قلوب میں گھسا ہوا ہے، قلوب کا فتنہ یہ ہے کہ اس میں خیر کی صلاحیت نہ رہے، اگر اس کے سامنے کوئی خیر کی بات لائی بھی جاتی ہے، تو شر وفساد کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس قلب کی مثال الٹے پیالہ جیسی ہو جاتی ہے، جس میں کوئی خیر کی بات نہ ٹھہرتی ہے اور نہ جمتی، بس اس کی خواہش نفس کی وجہ سے جو چیز چمٹ جاتی ہے، وہی رہتی ہے اور اس کے مناسب کوئی چیز مل جاتی ہے، تو وہ بھی چمٹ جاتی ہے۔

یہ دونوں طرح کے فتنے اس دور میں موجیں مار رہے ہیں، معاشرہ بھی فاسد ہے، اور قلوب بھی فاسد ہیں، قلب کا صلاح یہ ہے کہ وہ ان فتنوں کو رد کر دے، ان کا کوئی اثر قبول نہ کرے، وہ سنگ مرمر کی طرح سخت مضبوط اور چکنا ہو جائے کہ برائیاں اس سے ٹکرائیں تو، مگر اچٹ کر ناکام واپس ہو جائیں، قلب میں اگر اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے، تو اسے کوئی فتنہ ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

ایسے قلوب ہر زمانے میں کم رہے ہیں، اور ہمارے دور میں تو بہت کم ہیں، لیکن اللہ کی زمین خالی نہیں ہے، اچھے لوگ اور اچھے قلوب مل جاتے ہیں، گو مشکل سے ملتے ہیں اور کم ملتے ہیں، یہ قلوب فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اور فتنوں سے پناہ انھیں حضرات کے زیر سایہ مل سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: بَدَأَ الإسلامُ غریباً و سَیعودُ کما بَدَأَ غریباً فطوبیٰ لِلغُرَباءِ (مسلم شریف) اسلام کا جب آغاز ہوا تھا تو یہ لوگوں کے درمیان اجنبی تھا، یعنی لوگوں کا ماحول ومعاشرہ، ان کے احوال وکوائف بالکل جداگانہ تھے، اسی ماحول میں چند لوگوں نے اسلام قبول کیا، اس کے احکام وتعلیمات کو اپنی زندگی کا شعار بنایا، تو یہ لوگ سارے ماحول سے کٹے ہوئے اجنبی سے محسوس ہوئے، وہ خود اپنے کو اس ماحول میں اجنبی سمجھ رہے تھے، اور دنیا والے بھی انھیں اجنبیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر آہستہ آہستہ اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، لوگوں میں اس کا تعارف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ لوگ مانوس ہو گئے، اجنبیت دور ہو گئی، اب یہ ایک معروف ومسلم حقیقت بن کر لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں جاگزیں ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ مذہب دوبارہ اجنبی بن جائے گا۔ اسلام کے خلاف ایک ایسا ماحول برپا اور ایک ایسی تہذیب مسلط ہو جائے گی کہ اس ماحول میں اسلام پر عمل کرنے والا محض اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اب یہاں اہل اسلام کے سامنے دوراہیں ہیں، ایک یہ

کہ اپنی اجنبیت سے گھبرا کر، اس سے وحشت زدہ ہوکر اپنی مخصوص شناخت اور اپنی خاص وضع کو خیر باد کہہ کر عام ماحول و معاشرہ میں گھل مل جائیں، اسلام کے آثار و اعمال کو اپنے اوپر سے کھرچ کر پھینک دیں، تاکہ دیکھنے والا، برتنے والا جان ہی نہ سکے کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اسلام کے تقاضوں پر، اس کی تعلیمات پر، اس کی شناخت اور وضع پر باصرار ڈٹ جائیں، اور اس سلسلے میں کسی دباؤ کی پرواہ نہ کریں، دنیا مخالف سمت دوڑ رہی ہے، مگر یہ اپنی سمت جا رہے ہیں، دیکھنے والے دیوانہ اور سنکی کہہ رہے ہیں، ساری خلقت تو اُدھر جا رہی ہے، تم ادھر کہاں جا رہے ہو؟ یہ طعنے سنتے رہیں، تحمل کرتے رہیں، الجھنے سے گریز کرتے رہیں، مگر اپنی راہ پر لگے رہیں۔

اس آخری دور میں، اور اجنبیت کے اس ماحول میں یہ دو راہیں ہیں۔ پہلی راہ دنیاوی اعتبار سے آسان ہے، اس راہ میں آدمی خود کو چلتی بھیڑ میں گم کر دیتا ہے، اور دنیا کے اعتبار سے اس بھیڑ کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس میں یہ بھی حصہ دار بنتا ہے، اس میں بظاہر دنیا کا فائدہ ہے، زندگی کی سہولت ہے، جہاں جائے گا، کہیں اجنبیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا، لیکن اس سہولت کے لیے، اس کو ایک بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے، اور وہ بھی ناروا، وہ قربانی آخرت کی قربانی ہوتی ہے، جس طریق پر اسلام نے چلنے کی تلقین کی ہے، جب اسے چھوڑا تو آخرت کی راہ چھوڑی، جنت کی راہ چھوڑی،، ایمان میں اضمحلال پیدا ہوا، عبادات میں زوال آیا، طاعات سے برکنار ہوا، کفر والحاد کی موجودہ طوفانی ہوا میں بھی خطرناک راہ اختیار کرنے والے زیادہ ہیں، دنیا مقصود و معہود بنی ہوئی ہے، اس راہ میں آخرت کی تباہی تو ہے ہی، مسلمانوں کی دنیا بھی کچھ زیادہ بامراد نظر نہیں آتی، کیونکہ جب کہیں سود و زیاں کا معاملہ پڑتا ہے، تو کفر کی طاقتیں، انھیں مسلمان کہہ کر، ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتی ہیں، جو مسلمانوں کے حق میں ان کے منصوبے میں داخل ہوتا ہے، متعدد فسادات میں کمزور ایمان والوں نے اپنی شناخت چھوڑی، کفر کی شناخت اختیار کی، مگر نتیجہ وہی رہا کہ سب کے ساتھ وہ بھی ہلاک کر دیے گئے، دنیا بھی گئی، آخرت بھی گئی!! {خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ}

دوسری راہ دنیاوی اعتبار سے بہت مشکل ہے، لوگوں کے طنز و طعن ہیں، کوئی ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اپنے گھر میں بھی آدمی اجنبی بن جاتا ہے، وہ حال ہوجاتا ہے کہ بات کرے تو کوئی سننے کو تیار نہ ہو، رشتہ چاہے تو کوئی رشتہ کرنے پر آمادہ نہ ہو، دین پر عمل کرنے کا جذبہ، اسے اس کے ماحول سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے، اس سے سب خفا ہوتے ہیں، اور وہ سب سے علیحدہ ہو جاتا ہے، یہ حالت انسان کے لیے بہت سنگین ہوتی ہے، بڑے مضبوط ارادے اور بلند حوصلہ کا مالک ہوتا ہے وہ آدمی،۔۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ: ۳۴ پر)

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی *

روزے میں انجکشن، گلوکوز اور خون چڑھانے کا حکم

سوال: (۱) کیا انجکشن سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے؟ (۲) گلوکوز اور خون چڑھانے سے روزہ میں کوئی نقص تو نہیں آئے گا؟

جواب: (۱) انجکشن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ (۲) گلوکوز اور خون چڑھانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ہے جب کہ براہ راست خون معدہ میں داخل نہ کیا جائے۔ (فتاویٰ قاسمیہ ۱۱/ ۴۸۰)

روزہ کا فدیہ کافر کو دینا

سوال: روزہ کا فدیہ کافروں کو دینا درست ہے؟

جواب: روزہ کا فدیہ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ ۱۱/ ۵۳۴)

روزہ اور نماز کا فدیہ

سوال: ایک نماز اور ایک روزہ کا فدیہ کتنا ہوگا؟

جواب: ایک نماز اور ایک روزہ کا فدیہ ایک صدقۂ فطر ہے جس کی مقدار موجودہ اوزان سے ڈیڑھ کلو ۴۷/ گرام ۶۴۰/ ملی گرام گیہوں ہے، نیز مارکٹ سے اس قیمت معلوم کر کے رقم بھی دے سکتے ہیں۔

(فتاویٰ قاسمیہ: ۱۱/ ۵۲۷)

کان میں قصداً پانی ڈالنا

سوال: اگر کوئی روزہ کی حالت میں جان بوجھ کر کان میں پانی ڈالے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب: روزہ کی حالت میں کان میں پانی چلا جائے تو اس سے تو روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن اگر کوئی قصداً کان میں پانی داخل کرے تو روزہ کے فساد اور عدم فساد میں دونوں قول ہیں، اس لئے قضاء کر لینے میں ہی احتیاط ہے۔ (محمود الفتاوی ۴/ ۳۶۸)

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: RD/RNP/HSE/884/20-22
Date of Publication 3rd Apr-21, date of Posting 5th Apr-21

Printed.Published and Owned by Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Behind Masjid e Meraj, Sayeedabad, Hyd.